ڈاکٹر شاہ انجم

جلیلؔ قدوائی کی تحقیقی وتدوینی خدمات

زیرِ نظر مقالہ ایک اجمالی تعارف اور چند تمہیدی معروضات کے علاوہ درج ذیل حصّوں پر مشتمل ہے:

حصّہ اوّل: جلیل قدوائی کے مدوّنہ ادبی متون

(i) دیوانِ بیدار

(ii) مکتوباتِ عبدالحق

(iii) انشائے ہاشمی

حصّہ دوم: مشمولاتِ متن سے متعلق جلیلؔ قدوائی کی خدمات

(i) الحاقی کلام غالب کی داستان

(ii) جگر لخت لخت

(iii) اقبال کی بعض نظموں کا ابتدائی متن

حصّہ سوم: تدوینی خدمات بہ سلسلۂ راس مسعود

(i) خطوط Forster, Masood Letter

(ii) بیاض Relams of Gold

(iii) ڈائری Travels in Japan

(iv) مرقعِ مسعود (اُردو۔انگریزی)

(v) خیابانِ مسعود (اُردو۔انگریزی)

(vi) شعلۂ مستعجل (اُردو۔انگریزی)

(vii) اوراقِ گُل (اُردو۔انگریزی)

(viii) سرسیّد علیہ الرحمہ مع ضمیمہ سیّد محمود (اردو۔انگریزی)

حصّہ چہارم: انجمن ترقی اُردو کی اشاعتوں پر نظرِ ثانی واضافہ اور اشاعت

(۱)

تعارف:

زیرِ نظر مقالے کا مقصد مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے ایک تربیت یافتہ اور 'عبدالحق اسکول' کے ایک نمائندے جلیل قدوائی کی تحقیقی و تدوینی خدمات کا تنقیدی مطالعہ پیش کرنا ہے۔جلیل قدوائی کا پہلا مضمون ۱۹۱۹ء میں پنڈی بہاء الدین (گجرات) کے رسالے ''صوفی'' میں شائع ہوا۔اس وقت سے لے کر ۱۹۹۶ء تک آپ نے اپنی حیاتِ مستعار کے تقریباً ستّر برس علم و ادب کی خدمت میں گزار دیے۔ اس دوران آپ کی تقریباً دو درجن سے زائد کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر شائقینِ ادب کے ہاتھوں میں پہنچیں۔ یوں آپ نے تخلیق، تنقید و تحقیق اور ترتیب و تدوین کے شعبوں میں رجحان ساز خدمات انجام دے کر اپنے حصّے کی ذمّے داریوں کو جس احسن طریقے سے نبھایا وہ یقیناً لائقِ تحسین ہے۔

جلیل قدوائی کو بابائے اُردو مولوی عبدالحق سے جو ربط اور تعلقِ خاطر تھا وہ ریکارڈ پر ہے۔

آپ، بابائے اُردو کے نود سالہ جشن کے سلسلے میں عبدالحق جوبلی کمیٹی کے معتمد اعزازی بھی رہے۔محکمۂ اطلاعات سے ریٹائر ہونے کے بعد آپ نے انجمن ترقی اُردو میں تقریباً سولہ برس خدمات انجام دیں۔ یہاں آپ نے بابائے اُردو کی ڈکشنریوں کی نظرِ ثانی اور اشاعت کے کاموں کی نگرانی بھی کی۔

جلیل قدوائی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انھیں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اُردو میں جن ہستیوں نے لیکچرر منتخب کیا تھا ان میں علامہ اقبال اور سیّد سلیمان ندوی بھی شامل ہیں۔

آپ نے مولانا احسن مارہروی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ہمراہ شعبۂ اُردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں جو خدمات انجام دیں وہ تاریخی نوعیت کی حامل ہیں۔آپ کے فیض یافتہ افراد میں شان الحق حقی، علی سردار جعفری، اسرار الحق مجاز، جاں نثار اختر، سعادت حسن منٹو، ڈاکٹر ریاض الاسلام اور جی اے مدنی قابلِ ذکر ہیں۔

(۲)

تمہیدی معروضات:

جلیل کے تعارف کے بعد اب اردو میں ترتیب و تدوین کے حوالے سے چند معروضات پیش کی جاتی ہیں۔

ترتیب و تدوینِ متن کا شمار بھی ''تحقیق کے دوائرِ کار'' میں کیا جاتا ہے بلکہ یہ تو بہ قولِ رشید حسن خاں: ''تحقیق سے آگے کی منزل ہے'' ۔[۲]

اُردو میں اس کام کی ابتدا بھی صحیح معنوں میں بیسویں صدی کے آغاز میں حافظ محمود شیرانی نے کی۔ یہ نہیں کہ اس سے قبل اُردو میں کوئی کتاب مرتب اور شائع نہ ہوئی ہو۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کے تحقیقی جائزے ۳ سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کے کئی مطبوں نے بڑی تعداد میں کتابیں شائع کیں، جن میں منشی نول کشور کا مطبع اور اس کی خدمات سرِ فہرست ہیں۔ بے شک رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی مطبوعات بھی اپنے دوور کے لحاظ سے بہتر قرار دی جاسکتی ہیں لیکن ''تدوین'' کے جدید سائنٹیفک اُصولوں کے پیشِ نظر وہ بھی مطلوبہ معیار تک نہیں ۴ پہنچتیں۔ حافظ محمود خاں شیرانی کے بعد پچاس کی دہائی تک ایک عبوری دور ہے جس میں مولوی عبدالحق سب سے نمایاں ہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نزدیک بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے یا عبوری دور کے سب سے بڑے محقق ڈاکٹر مولوی عبدالحق ہیں۔ انھی کے ہاتھوں ادبی تحقیق کا خیال عام ہوا۔ ان کے اندازِ تحقیق وتدوین کو اپنانے یا آگے بڑھانے والے لوگوں میں پنڈت برجموہن، دتاتریہ کیفی، نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور پروفیسر محمود خاں شیرانی، پروفیسر حامد حسن قادری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی ادیب، سیّد سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی قابلِ ذکر ہیں ۵۔

مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء۔۱۹۶۱ء) کی تحقیق کو حالی اور شبلی دونوں کا سنگم کہا گیا ہے، یوں وہ اپنے اسکول کے آپ بانی ہیں جسے بجا طور پر عبدالحق اسکول کہا جاسکتا ہے ۶۔ مولوی عبدالحق کی علمی وادبی خدمات نصف صدی پر محیط ہیں۔ آپ کی علمی وادبی اور تحقیقی خدمات کے بارے میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ بجا فرماتے ہیں کہ: ''انھوں نے اردو زبان وادب کی ہر لحاظ سے بڑی خدمت کی ہے اور قدیم شاہکاروں کو نہ صرف چھپوایا بلکہ ان کی قدر و قیمت بھی واضح کی'' ۷۔ آپ کے ایک سوانح نگار ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب آپ کی خدمات کا بڑے جامع انداز میں جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

> ''۔۔۔انھوں نے انجمن کے سربراہ کی حیثیت سے دوسروں کو تحقیقی کام پر مامور کیا یا تحقیق کی مختلف طریقوں سے اعانت فرمائی بلکہ خود بھی تحقیق میں مصروف رہے۔ شعرائے اُردو کے کئی اہم تذکرے اور نثر ونظم کی کئی تصانیف بابائے اُردو کی تحقیق کی بدولت ہی منظرِ عام پر آئیں۔ لغت، تذکرہ، دیوان، مثنوی، نثر، دکنیات اور شمالی ہند کا ادب، لسانیات، قواعد سب پر انھوں نے کام کر کے اُردو تحقیق کو مختلف جہتوں سے آشنا کیا'' ۸۔

بابائے اُردو کے مرتب ومدوّن کردہ متون اور دیگر تحقیقی کاموں پر کلام کرنے سے پہلے یہ اہم بات بھی مدِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ اُس دور میں اُردو تحقیق وترتیب متن کے اُصول وضوابط مدوّن نہیں ہوئے تھے۔ شبلی، حالی اور بابائے اُردو کی عملی تحقیق ہی نے اس ضمن میں ابتدائی راستوں کی نشان دہی کی، رسمیات اور

قواعد وضوابط سمجھائے''۔ انھوں نے یہ سفر اپنے مزاج، تجربے اور مطالعے کی روشنی میں طے کیا تھا''۹۔

جلیلؔ قدوائی (۱۹۰۴ء۔۱۹۹۶ء) کی تحقیقی وتدوینی خدمات کا تعلق جس عہد سے ہے اسے ادبی تاریخ میں ''عبوری دور''۱۰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگرچہ آپ کا قلم بیسویں صدی کے آخری دہے تک چلتا رہا ہے، مگر آپ کے تصنیفی وتالیفی دور اوّل (۱۹۱۹ء۔۱۹۳۷ء) ہی کو آپ کے نمائندہ دور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

جلیل قدوائی بھی اُن محققین اور تنقید نگاروں میں شامل ہیں جنھوں نے عبدالحق اسکول کے واضح اثرات قبول کیے۔ چناں چہ آپ کی مذکورہ خدمات کے زیرِ نظر جائزے سے بھی یہ بات بخوبی سامنے آجائے گی کہ جلیلؔ قدوائی کا اندازِ تحقیق اور ان کے تدوینی کام کس حد تک مذکورہ اسکول کے مرہونِ منّت ہیں۔

جلیلؔ قدوائی نے عبدالحق اسکول کے جن رجحانات کو قبول کرتے ہوئے اپنے تحقیقی کاموں کا آغاز کیا ان میں ایک تو شعرائے اُردو کے دواوین کی ترتیب واشاعت ہے، جب کہ دوسرا اہم تحقیقی رجحان محققین کے کاموں کی جائزہ نگاری بہ شمول اغلاط کی نشان دہی اور تصحیح پر مشتمل ہے۔ بہ الفاظ دیگر کہا جاسکتا ہے کہ جلیلؔ قدوائی کی ادبی تحقیق مندرجہ ذیل پہلوؤں پر مشتمل ہے:

(i) تدوین متن اور اس کے متعلقات

(ii) تصحیحی تحقیق

سرِ دست زیرِ نظر جائزہ اوّل الذکر پہلو پر مشتمل ہے۔

(۳)

اب ذیل میں جلیلؔ قدوائی کی تحقیقی وتدوینی خدمات کا مطالعہ ترتیب وار پیش کیا جاتا ہے:

حصہ اوّل: جلیلؔ قدوائی کے مدوّنہ ادبی متون

۱۔ ''دیوان بیدارؔ'':

دیوانِ بیدارؔ کے اب تک دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ پہلی بار محمد حسین محوی صدیقی لکھنوی کا مرتبہ ''دیوان بیدار'' ۱۹۳۵ء۱۱ میں مدراس سے شائع ہوا تھا جب کہ دوسری بار جلیلؔ قدوائی کا مرتبہ دیوان بیدارؔ ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ مشفق خواجہ نے اپنے ''جائزۂ مخطوطاتِ اُردو'' میں دیوان بیدارؔ کے متعدد قلمی نسخوں کے علاوہ مذکورہ بالا دونوں مطبوعہ نسخوں کے ماخذ کا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ دیوان بیدارؔ کے مذکورہ دونوں مطبوعہ نسخوں کے تحقیقی مطالعے سے قبل مشفق خواجہ کی فراہم کردہ معلومات سے استفادہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ چناں چہ ''دیوان بیدارؔ'' مرتبہ محمد حسین محوی کے بارے میں جناب مشفق خواجہ رقم طراز ہیں کہ:

''۰۰۰اس کا متن دو نسخوں پر مشتمل ہے جس میں سے ایک تو عبدالقدوس پادشاہ کا نسخہ تھا، ۰۰۰ دوسرا مولوی عبدالحق کا نسخہ تھا جو انجمن ترقی اُردو، کراچی میں ہے، ۰۰۰مطبوعہ نسخے میں ۲۱۶ غزلیات، ۱۳ متفرق شعر، دس خمسہ جات، ۲۱ بند کا مسدس، بعنوان 'سلام بحضور سرورِ کائنات' اور ۱۶ رباعیاں شامل ہیں۔ اس نسخے میں بیدار کا فارسی کلام بھی شامل ہے''۔۱۲

پیش کردہ اقتباس میں جن دو ماخذی نسخوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ایک نسخہ تو محض ''دیوانِ بیدار'' کے انتخاب پر مشتمل تھا۔ اس نسخے کے بارے میں محمد حسین محوی خود اپنے مرتبہ دیوان بیدار کے مقدمے میں اطلاع دیتے ہیں کہ: ''نسخۂ مدراس پورا نسخہ نہیں بلکہ محض دیوانِ بیدار کا انتخاب ہے۔ پورا نسخہ یہ ہے جو حیدرآباد [دکن] سے آیا ہے''۔۱۳

اسی طرح دیوان بیدار کے دوسرے مطبوعہ نسخے کو جلیل قدوائی نے مولانا احسن مارہروی کے نسخے سے مقابلہ کر کے ترتیب دیا ہے۔

جلیل قدوائی اپنے نسخے کا تعارف پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

''دیوانِ بیدار، بانگ درا کے سائز کے ۱۴۷ صفحوں پر مشتمل ہے۔ ۰۰۰ کاغذ پرانا، بادامی، چکنا کہیں سے خراب نہیں ہوا ہے۔ اس میں چھوٹی بڑی ۲۲۶ غزلیں ہیں، ۲۶ رباعیاں، ۲ نعتیہ مسدس اور ۱۱ مخمس ۰۰۰ دیوان کی ترتیب میں یہ جدت ہے کہ ردیف وار غزلوں کے ساتھ رباعیاں بھی درج ہیں۔ کتابت باریک ہے اور جا بجا املا اور ہجے کی غلطیاں ہیں۔ کاتب کا نام نبی بخش ہے۔ خوش خط نہیں ہے۔ خود اعتراف کرتا ہے: 'بہ خط بد خط نبی بخش'۔ مگر کتابت صاف ہے، سال کتابت درج نہیں''۔۱۴ لیکن بیدار کی زندگی کے زمانے کا نسخہ نہیں ہے کیوں کہ آخر میں خود لکھا ہے: 'تمام شد دیوان من تصنیف مولوی محمدی بیدار صاحب اکبرآبادی مرحوم و مغفور''۔۱۵

جلیل قدوائی نے ''دیوانِ بیدار'' کی تدوین میں جو دوسرا نسخہ استعمال کیا ہے، وہ مولانا احسن مارہروی کی ملکیت تھا اس نسخے کے بارے میں جلیل قدوائی لکھتے ہیں:

''احسن صاحب کا نسخہ، ناقص، نامکمل ہے اور کسی حد تک زیادہ پرانا معلوم ہوتا ہے اور اس کا کاتب بھی بہت بد خط ہے تاہم مقابلہ فائدے سے خالی نہیں رہا۔ اس سے ایک پوری غزل نئی ملی اور اشعار تو بہت سے ملے بعض جگہ دونوں نسخوں کے متن میں اختلاف تھا۔ ایسے موقعوں پر میں نے شاعر کے زمانے کی زبان کا خیال رکھا ہے اور اپنی محدود بصیرت کے مطابق جو صورت بہتر اور زیادہ صحیح معلوم ہوئی اُسے متن میں قائم رکھا ہے۔ ہاں اختلاف ظاہر کرنے کو دوسری صورت حاشیے پر دکھا دی ہے، جہاں کہیں کتابت کی غلطیاں تھیں وہاں بھی اپنے عقل و ذوق کو راہ دی ہے''۔۱۶

اختلاف متن کو حاشیے پر دکھانا یقیناً تدوینِ متن کے اہم ترین اُصولوں میں سے ہے لیکن جلیل

قدوائی نے حاشیے میں اختلاف تو ظاہر کیا ہے ''مگر یہ نہیں بتایا کہ کس نسخے کو ترجیح دی ہے۔

جب کہ محمد حسین محوی نے حاشیے میں یہ التزام بھی کیا ہے کہ اختلافِ متن کے ساتھ ساتھ متعلقہ نسخے کی صراحت بھی کر دی ہے۔

اگر جلیل قدوائی بھی ایسا ہی کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ اس طرح یہ معلوم ہو جاتا کہ دونوں نسخوں میں کیا اختلاف ہے اور مُرتّب نے کسے ترجیح دی ہے۔

چوں کہ ''دیوان بیدار'' کے دونوں مطبوعہ نسخے دو مختلف ماخذی نسخوں کی بناء پر ترتیب دیے گئے ہیں اس لحاظ سے دونوں نسخے ہی اہم ہیں جناب مشفق خواجہ نے جلیل قدوائی کے مرتبہ نسخے کا مولوی عبدالحق کے نسخے سے موازنہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل رائے دی ہے:

> ''مخطوطے اور مطبوعہ نسخے (ہندوستانی اکیڈمی) میں اُردو کلام تقریباً برابر ہے۔ صرف چند غزلیں مطبوعہ میں زائد ہیں۔ یا پھر غزلوں کی ترتیب دونوں نسخوں میں قدرے مختلف ہے۔ مطبوعہ و مخطوطہ میں اختلافِ متن البتہ خاصا ہے۔ اس کی ایک دو مثالیں:
>
> مخطوطہ:
>
> حصولِ فقر گر چاہے ہے چھوڑ اسباب دنیا کو
> لگا دے آگ یک سر بستر سنجاب دنیا کو
> رکھیں ہیں حق پرستاں ترک جمعیت میں جمعیت
>
> مطبوعہ:
>
> ... چاہے تو چھوڑ ...
> ... سنجاب و دیبا کو
> رکھے ہیں ... ...
>
> مخطوطے میں کتابت کی اغلاط بھی خاصی ہیں۔ خصوصاً شروع کے ۳۵، اوراق میں جن کا کاتب حد درجہ بے احتیاط ہے، شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہوگا جو اغلاط سے پاک ہو''۔ ۱۷

یہ موازنہ تو جلیل قدوائی کے مطبوعہ نسخے کا مولوی عبدالحق کے مخطوطے پر مشتمل تھا جس کی خصوصیات جناب مشفق خواجہ نے نہایت جامع انداز میں پیش کی ہیں۔ اب ذیل میں دونوں مطبوعہ نسخوں کی تقابلی کیفیت بیان کرنے کے بعد ان کی دو دو غزلوں کا موازنہ بھی بطور مُشتے نمونہ از خروارے پیش کیا جاتا ہے۔

چناں چہ دونوں مطبوعہ نسخوں کا موازنے (Collation) کے سلسلے میں پہلی حمدیہ غزل ہی کو لیجیے اس میں پہلا فرق تو تعداد اشعار کا ہے۔ جب کہ اختلافِ متن بھی خاصا ہے۔ لیکن پہلے مذکورہ دیوان کا تقابلی

جائزہ ملاحظہ ہو:

''دیوانِ بیدارؔ'' مرتبہ جلیلؔ قدوائی	''دیوانِ بیدارؔ'' مرتبہ محمد حسین محوی
☆ اس کا متن دو مختلف نسخوں کے تقابلی مطالعے کے بعد تیار کیا گیا ہے۔	☆ اس کا متن بھی دو نسخوں کے تقابل پر مشتمل ہے۔
☆ اس نسخے میں ۲۲۶ غزلیں ہیں۔	☆ اس نسخے میں غزلیات کی تعداد ۲۱۶ ہے۔
☆ ۲۶/رباعیاں	☆ ۱۶/رباعیاں
☆ ۲/نعتیہ مسدس (پہلا مسدس ۲۱/اور دوسرا/۱۳۷/بند پر مشتمل ہے۔	☆ ۲۱ بند کا مسدس
☆ ۱۱/مخمس	☆ ۱۳/متفرق شعر
	☆ دس خمسہ جات
	☆ اس نسخے میں بیدارؔ کا فارسی کلام بھی شامل ہے۔

(حمد) غزل اوّل

نسخہ ج ق (نسخہ جلیلؔ قدوائی)	نسخہ م (نسخہ محمد حسین محوی)
غزل۔۱ تعدادِ اشعار۔۱۹	غزل۔۱ تعدادِ اشعار۔۱۸

یہ شعر نمبر ۷/نسخہ محوی میں نہیں ہے:

ٹک دیدۂ دل کھول کے تو دیکھ کہ رخشاں
ہر ذرۂ حادثات میں ہے خورشید قدم کا

شعر ۳ نسخہ ج ق	شعر: ۳ نسخہ م
کیا جانے کہاں جلوہ نما تو ہے کہ یاں تو ہے داغ تری یاس سے دل دیر و حرم کا	کیا جانیے کیا جلوہ نما تو ہے کہ تھا تو ہے داغ ترے یاس سے دل دیر و حرم کا
شعر: ۷ مصرعۂ اولیٰ	شعر: ۷۔ مصرعۂ اولیٰ
پہنچائیو واں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔	پہنچائیو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔واں

شعر:۱۳ مصرعِ اولیٰ	شعر:۱۳ مصرعِ اولیٰ
ع لے ہاتھ میں شمشیر عدالت کی عمر نے	ع لی ہاتھ میں شمشیر عدالت کی عمر نے
شعر:۱۴ دوسرا مصرع	شعر:۱۴ دوسرا مصرع
ع ہیبت سے جگر آب ہو شیرانِ رجم کا	ع ہیبت سے جگر آب ہو شیرانِ اجم کا
''شیران رجم''	''شیران اجم''

پہلی نظر میں دونوں ہی تراکیب محلِ نظر ہیں لیکن شیران اجم شاید درست ہو کیوں کہ اَجَم کے معنی جہاں ''ایک غذا سے اُکتا جانا'' ہے۔[۱۸] وہیں اَجمہ کے معنی ''جنگل''[۱۹] کے بھی ہیں۔ علاوہ ازیں شان الحق حقی نے اَجَم کے معنی ''کچھار، شیروں کا ٹھکانہ، اور جنگل''[۲۰] بیان کیے ہیں۔ چناں چہ یہ ترکیب شیرانِ اجم اس لحاظ سے درست معلوم ہوتی ہے۔

غالباً نسخہ جلیل قدوائی میں بھی اجم ہو لیکن ٹائپ کی غلطی سے رجم لکھا گیا ہو۔

غزل (۲)

نسخہ جلیل قدوائی	نسخہ محمد حسین محوی
غزل ۲ تعدادِ اشعار ۹	غزل ۲ تعدادِ اشعار ۸
ش نمبر ۳: پہلا مصرع	
شکر ایک بھی احساں کا ادا ہوئے نہ مجھ سے	شکر ایک ہی احسان کا بیاں ہوئے نہ مجھ سے
ش نمبر ۴	ش نمبر ۴
میں خاک نشیں مو مرا آلودۂ عصیاں	ہیں خاک نشیں سر بسر آلودۂ عصیاں
کس منہ سے کروں وصف اب اس فرش مکاں کا	کس منہ سے کروں وصف اب اس عرش مکاں کا
مومرا آلودۂ عصیاں	سربسر آلودۂ عصیاں
فرش مکاں کا	عرش مکاں کا
شعر نمبر ۵	نسخہ محوی میں یہ شعر نہیں ہے۔
''یک جلوۂ دیدار اگر پاؤں میں تیرا	
کافر ہوں جو پھر لوں میں کبھی نام بُتاں کا	

کہاں کا، میاں کا، اس ردیف کے حامل شعر کی ترتیب میں فرق ہے۔ نسخہ جلیل قدوائی ''ردیف کہاں کا'' حامل شعر پہلے آتا ہے جب کہ نسخہ محوی کی ترتیب میں یہ آخری شعر ہے یعنی مقطع سے قبل۔ اس غزل

میں بھی تعدادِ اشعار کا فرق ہے۔ نسخۂ جلیل میں یہ غزل نو شعروں پر مشتمل ہے جب کہ محمد حسین محوی کے مرتبہ دیوان میں اس غزل کے آٹھ شعر ہیں۔

نسخۂ جلیل میں زائد شعر ترتیب کے لحاظ سے پانچویں نمبر پر ہے۔ دونوں مطبوعہ نسخوں کے اختلافِ متن کو دیکھتے ہوئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تفصیلی مقابلہ کرکے نیز دیگر دست یاب نسخہ جات کے موازنے کے بعد دیوان بیدار کا ایک بہترین متن ترتیب دیا جائے۔ کیوں کہ میر و سودا کے ہم عصر ہونے کے باعث میر محمدی بیدار دہلوی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

اسی اہمیت اور ضرورت کے پیشِ نظر جلیل قدوائی بھی ''دیوانِ بیدار'' کی تدوین کرنا چاہتے تھے جس کے لیے انھوں نے رضا لائبریری رام پور میں موجود اس کے ایک خطی نسخے کے حصول کے لیے مولانا امتیاز علی عرشی رام پوری کو خط بھی لکھا تھا اور ''دیوانِ بیدار'' کے نظر ثانی شدہ ایڈیشن کی طباعت کے لیے امتیاز علی تاج مرحوم سے بات بھی ہوگئی تھی جو ان دنوں مجلسِ ترقی ادب کے ناظم تھے۔ لیکن اس کے لیے دیوان مذکور کے رام پور لائبریری میں موجود نسخے سے مقابلہ کرنا ضروری تھا مگر بعض وجوہات کی بناء پر جلیل قدوائی رام پور نہ جا سکے لیکن انھوں نے عرشی رام پوری کو جن سے اُن کے پرانے مراسم تھے خط لکھا، انھوں نے پہلے تو کسی صاحبِ ذوق سے یہ کام لینے کا ارادہ کیا مگر شاید انھیں مطلوبہ قابلیت کا کوئی شخص نہ مل سکا تو انھوں نے دیوان مذکور کے مقابلے کا کام بہ نفسِ نفیس انجام دیا۔ بہر حال یہ کام بھی عرشی مرحوم کی مہربانی اور علم دوستی کی بدولت انجام پایا۔ علامہ عرشی نے جلیل قدوائی کے نسخے پر ایسے تمام اختلاف متن درج کرکے اپنی یادداشتوں کے ساتھ انھیں واپس کر دیا۔ مگر تاج مرحوم کی وفات کے بعد مجلسِ ترقی ادب کے نئے ذمہ داروں نے اس کام کو پس پشت ڈال دیا۔ بقول جلیل قدوائی جب ''اس ادارے کے ساتھ سابقہ مراسلت کے حوالے سے دیوانِ بیدار کی اشاعت کے لیے سلسلہ جنبانی کی گئی تو انھوں نے خطوط کا جواب دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔''[۲۱]

چناں چہ دیوانِ بیدار کے سلسلے میں مولانا عرشی کا مذکورہ خط ملاحظہ ہو:

''رام پور رضا لائبریری

رام پور

۲۶ر فروری ۱۹۶۵ء

مکرمی و محترمی۔ سلام مسنون

دیوانِ بیدار کی نقل مل جائے گی۔ مگر اس کے لیے آپ کو اپنے ہائی کمیشن کی وساطت سے تحریک کرنا چاہیے۔

آسان صورت یہ ہے کہ آپ 'دیوانِ بیدار' کا مطبوعہ نسخہ ارسال کر دیں۔ میں یہاں کسی صاحبِ ذوق

کو مقرر کر دوں اور وہ مقابلہ کر کے اختلاف نوٹ کر لے اور یہ سب کچھ آپ کو بھیج دیا جائے۔ لیکن مصارف اس میں ہوں گے۔ اب ارشاد ہو کہ کون سی راہ آپ پسند فرماتے ہیں۔ میں کئی سال تک (بہ شرطِ زیست) بے حد مصروف ہوں۔ اس لیے شاید سفر نہ کر سکوں، لیکن قرب و بعید کا تعلق جسم سے زیادہ روح سے ہے اور آپ یقین فرمائیں کہ آپ بھی ان حضرات میں شامل ہیں جنھیں میں یاد کیا کرتا ہوں۔ یقین کرتا ہوں کہ آپ بھی ظاہری تعلق کی کمی کو میری یاد میں حائل نہ ہونے دیں گے۔

دعاؤں کا طالب

مخلص عرشی''[۲۲]

دیوانِ بیدار کی تدوینِ نو کے سلسلے میں جلیل قدوائی کی کوششوں کا مولانا امتیاز علی عرشی کے مندرجہ بالا مکتوب اور اس کے حواشی سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جلیل قدوائی نے مندرجہ بالا مکتوب کے ایک حاشیے میں بتایا ہے کہ ان کے نسخۂ دیوان بیدار پر مولانا امتیاز علی عرشی رام پوری کی تقابلی یادداشتیں ''ایک قابلِ قدر عزیز یادگار کے طور پر۔۔۔ محفوظ''[۲۳] ہیں۔ لیکن افسوس کہ بعد میں یہ قیمتی دستاویز اُن سے جاتی رہی۔ کیوں کہ ایک صاحب نے اُن سے دیوانِ بیدار کا مذکورہ قابلِ قدر نسخہ مستعار لیا اور جو آخر تک واپس نہیں ہوا۔ جلیل قدوائی کو اس بات کا بے حد قلق تھا جس کا وہ اکثر اظہار کیا کرتے تھے۔ راقم الحروف کے نام اپنے ایک مکتوب میں بھی جلیل قدوائی لکھتے ہیں کہ:

> ''دیوانِ بیدار' بھی مرے پاس نہیں۔ کراچی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کے موجودہ صدر[۲۴] لے گئے تھے کم از کم چھ سال ہوئے۔ آج تک واپس نہیں کیا۔ وعدے کیے جاتے ہیں کہ واپس کر دوں گا اور اپنی غلطی کی معافی کے لیے آپ کے پیر پکڑ لوں گا۔''[۲۵]

چناں چہ دیوان بیدار کا مذکورہ نسخہ آخر تک جلیل قدوائی کو واپس نہ مل سکا یوں ایک نہایت اہم علمی منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ اب جب کہ جلیل قدوائی اور پروفیسر جمیل اختر دونوں ہی مرحوم ہو چکے اس کی بازیافت اور زیادہ مشکل معلوم ہوتی ہے کاش کسی طور اس اہم نسخے کی بازیافت ہو سکے یا پھر کوئی نئے سرے سے یہ خدمت سرانجام دے سکے تو کیا ہی اچھا ہو۔

''دیوان بیدار'' کا مقدمہ:

جناب خلیق انجم۔ نے اپنی کتاب ''متنی تنقید'' (طبع اوّل) کے صفحہ نمبر ۱۰۲ پر ''اعلیٰ تنقید'' کے تحت جن موضوعات کا ذکر کیا ہے، اُن میں ''متن کا مقدمہ'' بھی آتا ہے۔ نیز مذکورہ کتاب کے صفحہ نمبر ۱۴۳ پر آپ رقم طراز ہیں کہ: ''متن کے تنقیدی ایڈیشن کے تیار ہونے کے بعد اُس کا مقدمہ لکھنا چاہیے''۔[۲۶]

چناں چہ جلیل قدوائی نے ''دیوانِ بیدار'' کا متن مرتب کرنے کے بعد اس پر ایک بھرپور مقدمہ تحریر

کیا جو ''دیوانِ بیدارؔ'' کی اشاعت سے قبل مضمون کی صورت میں بھی شائع ہو چکا تھا۔ جس کی تفصیل اپنے مقام پر پیش ہوگی۔ ذیل میں اس مقدمے کا تحقیقی جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

بیدار دہلوی، میر و سودا کے ہم عصر تھے، ان کے بارے میں ہمارے تذکرہ نگاروں نے یقیناً کم التفاتی کا مظاہرہ کیا ہے یہی وجہ ہے کہ کسی تذکرے سے ان کے تفصیلی اور محقق احوال دست یاب نہیں ہوتے۔

حُسنِ اتفاق سے جلیلؔ قدوائی کو علی گڑھ میں بیدارؔ کے اُردو اور فارسی کے دیوان دست یاب ہو گئے، چناں چہ ۱۹۳۲ء میں بیدارؔ کے اُردو دیوان پر انھوں نے پہلی بار تمام معتبر اور دست یاب مآخذ سے تحقیق و تنقید کے اصولوں کی روشنی میں استفادہ کرتے ہوئے زیرِ نظر مضمون تحریر کیا۔ یہ بیدارؔ دہلوی پر اوّلین تحقیقی تحریر تھی، جو ۱۹۳۲ء میں سہ ماہی ''ہندوستانی'' الٰہ آباد میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں جب جلیلؔ قدوائی کا مرتبہ ''دیوان بیدارؔ'' ان کے تصحیح و حواشی کے ساتھ شائع ہوا تو زیرِ نظر مضمون ہی کو اس کا مقدمہ بنایا گیا۔ یہ دیوان ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد نے ۱۹۳۷ء میں شائع کیا جب کہ اس سے قبل ۱۹۳۵ء میں پہلی بار ''دیوانِ بیدارؔ'' مدراس سے شائع ہو چکا تھا جسے محمد حسین محوؔی نے مرتب کیا تھا انھوں نے بھی اس پر ایک طویل مقدمہ تحریر کیا تھا۔

آخر الذکر کے مقدمے کی بحث اور انداز سے صاف جھلکتا ہے کہ جلیلؔ قدوائی کا زیرِ نظر مضمون موصوف کے پیشِ نظر رہا ہے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بیدارؔ پر اس اوّلین اور اہم تحقیقی مضمون سے استفادے کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔

اس مقدمے میں جلیلؔ قدوائی نے بیدارؔ اور ان کے اُردو دیوان کے بارے میں جو اہم اور تحقیقی معلومات پیش کی ہیں ان کا جائزہ پیش کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مآخذ پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ اس مضمون کے مآخذ مندرجہ ذیل ہیں:

۱) تذکرۂ ''گلِ رعنا'' مؤلفہ حکیم مولوی عبدالحیٔ لکھنوی، اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۳۴۳ھ
۲) ''تذکرۂ شعرائے اُردو'' مؤلفہ میر حسن، مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس ۱۹۲۲ء
۳) ''نکات الشعرا'' مؤلفہ میر تقی میر مطبوعہ نظامی پریس بدایوں
۴) مقدمہ ''مخزن نکات'' نوشتہ مولوی عبدالحق
۵) ''مخزن نکات'' مؤلفہ میر قائم چاند پوری مطبوعہ انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد، دکن، ۱۹۲۹ء
۶) ''چمنستانِ شعرا'' مؤلفہ لچھمی نراین، شفیق اورنگ آبادی، انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد، دکن ۱۹۲۸ء
۷) ''گلشنِ ہند'' مؤلفہ میر علی لطف مطبوعہ رفاہ عام پریس لاہور، ۱۹۰۶ء
۸) ''سخنِ شعرا'' مؤلفہ عبدالغفور خاں نساخ، مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ

۹) ''گلشنِ بے خار'' مؤلفہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ
۱۰) ''شعر الہند'' (۲ جلد) مولانا عبدالسلام ندوی، اعظم گڑھ، دار المصنفین۔
۱۱) ''مقدمۂ دیوان درد'' مطبوعہ نظامی پریس بدایوں نوشتہ مولوی حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی
۱۲) مرزا فرحت اللہ بیگ (مضمون بر) آغا جان عیش دہلوی مشمولہ رسالہ اُردو جلد ۸، صفحہ ۳۲
۱۳) مثنوی ''سحر البیان'' مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۲۵ء
۱۴) دیباچۂ ''آبِ حیات''، مولانا محمد حسین آزاد، لاہور
۱۵) دیوان بیدار (قلمی) نسخۂ مولانا احسن مارہروی

ان اہم مآخذ کے علاوہ جلیل قدوائی نے اپنے اس مقدمے میں جا بجا کلامِ بیدار کا موازنہ میر، سودا، درد، غالب، میر حسن، حالی، سودا کے شاگرد میاں معین، انشا اور اقبال کے کلام سے کیا ہے۔ کلامِ بیدار کے تجزیے کے لیے آپ نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کی صراحت کرتے ہوئے جلیل قدوائی لکھتے ہیں کہ:

> ''... یہ یاد رکھیے کہ ہم اُن قدیم محترم بزرگوں کو آج کے معیارِ مذاق سے جانچ کر ان کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے، اس کے لیے اسی زمانے کے مذاق کا جامہ پہن کر ان کے حضور میں جانا ہوگا۔''[۲۷]

جلیل قدوائی کا نظریۂ تنقید بھی قابلِ توجہ ہے جسے انھوں نے اپنے اس مقدمے میں برتا ہے۔ یہ امر پیشِ نظر رہے کہ تجزیے کا مذکورہ طریقہ جلیل قدوائی نے اس زمانے میں اختیار کیا تھا جب کہ اُردو میں سائنٹیفک طریقۂ کار کا چلن عام نہیں ہوا تھا۔

زیرِ نظر مضمون یا مقدمے کے مآخذ اور طریقۂ تحقیق و تنقید پر ایک نظر ڈال لینے کے بعد ذیل میں اس مضمون کے چند اہم امور پیش کیے جاتے ہیں تا کہ آئندہ صفحات میں ان معلومات کا موازنہ دیگر محققین اور ناقدین کے نقطہ ہائے نظر سے بخوبی کیا جا سکے۔

بیدار دہلوی پر مندرجہ ذیل امور تحقیق طلب تھے:

۱) نام کی تحقیق
۲) نسب کی تحقیق
۳) جائے پیدائش کی تحقیق
۴) سالِ ولادت کا تعین
۵) سالِ وفات

۶) کیا بیدار اپنا اُردو کلام درد کو دکھاتے تھے؟ نیز وہ درد کے شاگرد تھے؟

۷) کلامِ بیدار پر نقد اور مقام و مرتبے کا تعین

چوں کہ بیدار کے حالات خصوصاً نام و نسب، جائے پیدائش اور سالِ ولادت کے بارے میں کسی معاصر تذکرے سے کچھ پتا نہیں چلتا لہٰذا معاصر شہادتوں کی بناء پر قیاس ہی کیا جا سکتا تھا۔ اس بارے میں جلیل قدوائی لکھتے ہیں:

''افسوس ہے کہ قدیم شعرا کے حالات جمع کرتے وقت ہمیں صرف قیاسات اور حسابات سے کام لینا پڑتا ہے اور تذکرہ نویس اس باب میں بہت کم اعانت کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ قیاسات غلط ہوں مگر کم از کم اس سے شاعر کے زمانے اور عمر کا کسی نہ کسی حد تک صحیح تعین ضرور ہو سکتا ہے۔'' ۲۸

جلیل قدوائی کی مذکورہ صراحت سے اس صورتِ حال کا کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے جس میں زیرِ تحقیق موضوع کا نام و نسب، مولد اور سالِ پیدائش جیسے بعض ضروری امور کے سلسلے میں بھی تاریخی دستاویز کی عدم موجودی کس قدر دشواری کا باعث بنی ہوگی۔

جلیل قدوائی نے متعدد تذکرہ نگاروں میں سے صرف ان کے بیانات کو ترجیح دی ہے جنھوں نے بیدار سے ذاتی واقفیت کا اظہار کیا ہے۔ یا بیدار سے ملاقات کی ہو یا انھیں دیکھا ہو۔

دیکھا جائے تو یہ تحقیق کا بنیادی اُصول ہے کہ اوّلین ماخذ کو ترجیح دی جائے، اور جلیل قدوائی نے ایسا ہی کیا ہے۔ انھوں نے بحث اور نقد و تحقیق کے بعد تذکرۂ گلِ رعنا مؤلفہ حکیم مولوی عبدالحئی کی رائے کو اختیار کرتے ہوئے بیدار کا نام عرفیت اور تخلص کے بارے میں لکھا ہے کہ بیدار کا اصل نام:

''میر محمد علی عرف میر محمدی المتخلص بہ بیدار، دہلی، محلہ عرب سرائے کے رہنے والے اور میر و سودا کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے اُردو اور فارسی دونوں میں مشقِ سخن کی اور استادی کا مرتبہ حاصل کیا تھا۔ مولانا محمد فخر الدین دہلوی کے مرید تھے اور انھیں کے فیضانِ صحبت سے انھوں نے طریقۂ چشتیہ کے اذکار و اشغال کی ورزش کی اور لباس درویشی اختیار کر کے آخر خرقۂ خلافت پہنا۔ مرنے سے کچھ دن پہلے دہلی چھوڑ کر آگرہ چلے گئے اور کٹرا دنداں فیل میں مقیم ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔'' ۲۹

بیدار کے احوال میں میر تقی میر کا یہ بیان بھی جلیل قدوائی کے پیشِ نظر رہا ہے: ''جوانے است از یارانِ مرتضیٰ قلی بیگ فراق، مصرعہ ریختہ درست موزون می کند۔'' ۳۰

میر تقی میر کے بیان کی روشنی میں بیدار کے سالِ پیدائش کا تعین کرتے ہوئے آپ رقم طراز ہیں کہ:

''اگر میر صاحب نے بیدار کا حال ۱۱۶۵ ہجری میں لکھا تھا اور ہم اندازاً بیدار کی عمر اس وقت بیس سال کی مان لیں تو ان کی تاریخ پیدائش ۱۱۴۵ ہجری ہوئی۔'' ۳۱

بیدار کے سالِ وفات کے بارے میں جلیل قدوائی نے مولوی عبدالحئی کے بیان کو ۳۲ تسلیم کیا ہے، جس کے مطابق ''بیدار نے ۱۲۰۹ ہجری میں وفات پائی، اس حساب سے ان کی عمر چونسٹھ برس کی ہوئی۔'' ۳۳

مندرجہ بالا اقتباسات میں جلیل قدوائی نے بیدار کے بارے میں جو اہم معلومات فراہم کی ہیں انھیں ذیل میں نکات وار بیان کیا جاتا ہے:

☆ نام: میر محمد علی عرف میر محمدی المتخلص بہ بیدار

☆ وطن: دہلی، عرب سرائے کے رہنے والے تھے، آخری وقت آگرہ چلے گئے تھے۔

☆ مشرب: مولانا فخرالدین دہلوی کے مرید ہو کر چشتیہ سلسلے میں اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے تھے۔

☆ سالِ پیدائش ۱۱۴۵ھ

☆ سالِ وفات ۱۲۰۹ھ

محمد حسین محوی نے اپنے مقدمے میں بیدار کے متعلق تقریباً یہی معلومات دہرائی ہیں صرف سن پیدائش کے ضمن میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ بیدار ۱۱۴۰ھ تا ۱۱۴۵ھ کے درمیان پیدا ہوئے۔ ۳۴

جلیل قدوائی اور محمد حسین محوی کے ایک عرصے بعد دو افاضل جناب مشفق خواجہ اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان امور پر اپنی تحقیقات پیش کی ہیں۔

ذیل میں بالترتیب ان کے نتائجِ تحقیق پیش کیے جاتے ہیں تاکہ اپنے مقام پر جلیل قدوائی کی تحقیقات سے بہ سہولت موازنہ کیا جا سکے۔

جناب مشفق خواجہ نے جائزۂ مخطوطاتِ اُردو (جلد اوّل) میں ''دیوان بیدار'' کے خطی نسخوں کا تعارف پیش کرتے ہوئے جو معلومات پیش کی ہیں ذیل میں ان کا خلاصہ نکات وار پیش کیا جاتا ہے:

☆ میر حسن اور مصحفی چوں کہ بیدار سے ذاتی طور پر واقف تھے، اس لیے ان دونوں کے بیانات کی بنیاد پر صحیح نام ''محمد علی'' اور عرفیت 'میر محمدی' قرار دی جا سکتی ہے۔

☆ ذکا اور قاسم نے انھیں سادات میں سے بتایا ہے۔

☆ بدایوں کو وطن لکھنا درست نہیں۔ ان کا وطن ''دہلی'' ہی تسلیم کرنا ہوگا۔

☆ میر کے بیان کی روشنی میں بیدار کا سالِ ولادت ۱۱۴۵ھ کے لگ بھگ قرار پاتا ہے۔

☆ صحیح سالِ وفات ۱۲۱۲ھ ہے جو عشقی نے لکھا ہے۔

☆ فراق کی شاگردی میں کوئی شک نہیں۔

☆ شاہ حاتم اور میر درد کا شاگرد ہونے کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا۔ ۳۵

اسی طرح بیدار پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک نئے ماخذ کی روشنی میں اپنی تحقیق کی بنیاد رکھتے ہوئے تقریباً مختلف نتائج اخذ کیے ہیں۔ آپ نے ۱۲۹۸ھ/۸۴-۱۷۸۳ء کی ایک تصنیف ''چمنستانِ رحمتِ الٰہی'' از واحد یار خاں پر اپنی تحقیقات کی بنیاد رکھی ہے۔ جس میں مصنف نے اپنے مرشد حضرت عبداللہ فاروقی بے تاب کا ذکرِ خیر کیا ہے، ڈاکٹر صاحب کے بقول:

''اس میں جہاں عبداللہ بے تاب کے والد اور دادا کا ذکر آیا ہے وہیں ان کے تایا شاہ محمدی بیدار کے حالات بھی درج ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ شاہ محمدی بیدار بدایوں کے شیخ فاروقی خاندان سے تھے۔ اس خاندان کا تعلق حضرت فریدالدین گنج شکر کی اولاد سے تھا۔ میر محمدی بیدار کے والد کا نام شیخ عین الدین تھا جن کا سلسلہ نسب چودہ واسطوں سے حضرت گنج شکر سے جاملتا ہے۔ شیخ عین الدین کی شادی فتح پور سیکری میں حضرت سلیم چشتی کی اولاد میں ہوئی تھی۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک شیخ عماد الدین شاہ محمدی بیدار اور دوسرے شیخ امام الدین۔۔۔۔ شاہ محمدی کی پرورش ننھیال میں ہوئی اور دہلی میں علوم کی تحصیل کی۔۔۔۔ مرشد کے ارشاد پر بیدار نے دہلی سے اکبر آباد جا کر شیخ سلیم چشتی کے سجادۂ ارشاد کو زینت بخشی۔ وہیں ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۱۰ھ-۴ جولائی ۱۷۹۶ء کو وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں۔ ان کا مزار اکبری مسجد کے قریب زیارت گاہ انام ہے۔۔۔۔ بیدار کے مزار پر یہ قطعۂ تاریخِ وفات کندہ ہے:

بیدار کہ بود فخرِ اہلِ عرفاں
ہرگہ کہ ازیں سرائے فانی بگزشت
تاریخ برائے رحلتش ہاتف گفت
''آں ہادیِ آفاق بحق واصل گشت'' ۳۶

۱۲۱۰ھ/۱۷۹۶ء

اس اقتباس سے ماضی کی وہ تمام گتھیاں سلجھ جاتی ہیں جنھیں ناتمام شواہد کی بناء پر مجبوراً چھوڑ دیا گیا تھا۔ چوں کہ تحقیق میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوا کرتی اس لیے جوں جوں بحرِ علم اپنے خزانے اُگلتا رہتا ہے توں توں اہلِ تحقیق اس خزانے سے دنیائے علم کی روشنی بڑھاتے رہتے ہیں۔

اگر بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو جناب جلیل قدوائی کی مساعی جمیلہ لائقِ مشکور ہیں۔ جنھوں نے اُس وقت بیدار پر اپنی تحقیقات پیش کیں جب بیدار پر اس نوعیت سے قلم نہیں اُٹھایا گیا تھا۔

یہ بات بھی تاریخی حیثیت سے کچھ کم اہم نہیں کہ بیدار پر جلیل قدوائی کی تحقیقات ۱۹۳۲ء سے ریکارڈ پر ہیں۔ تقریباً ۴۵ برس بعد نئے ماخذ کی دست یابی نے بیدار کے حالات کے ضمن میں تقریباً سبھی تحقیقی

نظریات کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے لیکن یہ بات بھی کچھ کم نہیں ہے کہ مذکورہ پینتالیس برس تک بیدارؔ کے نام، سالِ ولادت، سالِ وفات، وطن، مشرب اور تلمذ جیسے اہم اُمور پر جلیلؔ قدوائی کے تحقیقی نتائج اور فرضیے، (Hypothesis) کو پایۂ اعتبار حاصل رہا ہے اور جنھیں معمولی اختلافات کے ساتھ تقریباً سبھی اہلِ تحقیق قبول بھی کرتے آئے ہیں۔

اس جائزے میں بیدارؔ پر ان کے احوال کے ضمن میں جن فاضلانِ تحقیق سے جلیل قدوائی کا موازنہ پیش کیا گیا ہے ان میں محمد حسین محوی لکھنوی اور دوسرے جناب مشفق خواجہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں آخر میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیقات کا خلاصہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ اس مطالعے کو نظر میں رکھتے ہوئے اب کلام بیدارؔ کے محاسن کے بارے میں جلیل قدوائی کے نقد و نظر کو سامنے لاتے ہیں۔

کلامِ بیدارؔ کی عام خصوصیات کے بارے میں جلیلؔ قدوائی رقم طراز ہیں کہ:

> ''بیدارؔ کے کلام کی عام خصوصیات کم و بیش وہی ہیں جو میرؔ و سوداؔ، اور اُن کے معاصر شعرا کے ہاں عام طور پر پائی جاتی ہیں یعنی زبان کی صفائی، دل کش و دل پذیر محاورات، ندرتِ بیان، معتدل حد تک تشبیہ و استعارہ کا استعمال، سوز و اثر وغیرہ لیکن ... ان کے کلام کا ایک معتد بہ حصہ خواجہ میر دردؔ کے رنگ میں ہے اور بعض غزلیں تو شروع سے آخر تک مسلسل تصوّف و اخلاق کے مضامین سے لبریز ہیں''۔ ۳۷

جلیلؔ قدوائی نے دیوانِ بیدارؔ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ مولوی عبدالحیؔ کی مندرجہ ذیل رائے سے مکمل اتفاق کرتے نظر آتے ہیں کہ بیدارؔ:

> ''میر و مرزا کے ہم عصر تھے۔ جب انھوں نے رعایت لفظی کے ناپسندیدہ رنگ کو ترک کیا تو بیدارؔ نے بھی اس میں کوشش کی اور صفائی کے ساتھ تصوّف کا رنگ بہ قدر مناسب شامل کر کے اپنے طرزِ کلام کو علاحدہ کر لیا''۔ ۳۸

زیرِ نظر مضمون میں جلیلؔ قدوائی نے دردؔ اور بیدارؔ کی کچھ ہم طرح غزلیں پیش کی ہیں تاکہ ''بیدارؔ کے رنگِ کلام کی نسبت زیادہ آسانی سے اور بہتر رائے قائم کرنے کا موقع ملے''۔ ۳۹

اس موازنے میں جلیلؔ قدوائی نے دردؔ اور بیدارؔ کی پوری پوری ہم طرح غزلیں پیش کرنے کے بعد 'اخلاق و تصوّف' کے رنگ میں ڈوبی ہوئی چند غیر طرح کی غزلیں' ۴۰ بھی پیش کر کے ''اشعار کی یک رنگی، ہمواری اور تسلسلِ مضامین کی بابت ناظرین' ۴۱ سے دادِ سخن کے طالب ہوئے ہیں۔

جلیلؔ قدوائی نے دیوان بیدارؔ سے ''سوز و گداز، درد و اثر، سادگی و نرمی اور تصوّف و اخلاق'' ۴۲ جیسی صفات کا حامل کلام کا نمونہ پیش کر کے یہ نہیں کہا کہ بیدارؔ کا سارا کلام ایسا ہی ہے بلکہ وہ رقم

طراز ہیں:

''اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ بیدارؔ کا تمام کلام ایسا ہی ہے اور دیوان دردؔ کی طرح دیوانِ بیدارؔ بھی سر سے پاؤں تک رموز و اسرار اور معرفت و اخلاق کا گنجینہ ہے اور بقول میر حسن کلام حافظ کی طرح 'سراپا انتخاب' ہے غلط ہے۔''۴۳

چناں چہ انھوں نے ان کی کمزوریوں کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔ اس کے بعد جلیل قدوائی نے کلامِ بیدارؔ کی دیگر خصوصیات گنواتے ہوئے اسے مثالوں سے مزین کیا ہے۔

اب ذیل میں اختصار سے کام لیتے ہوئے مزید کچھ مثالوں سے چیدہ چیدہ نکات اخذ کر کے پیش کیے جاتے ہیں۔ جس سے کلامِ بیدارؔ کی گوناگوں خصوصیات کے ساتھ ساتھ خود جلیلؔ قدوائی کے تنقیدی شعور کا بھی بخوبی اظہار ہوتا ہے۔

- اُن کے اشعار میں میرؔ و مرزاؔ اور ایک حد تک خود خواجہ میر دردؔ کے مقابلے میں اندازِ بیان کا لطف اور صفائیِ زبان کا مزہ زیادہ پایا جاتا ہے اور اس حیثیت سے اُن کا کلام اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ بعض بعض جگہ ڈیڑھ دو سو برس پرانا ہونے کے بجائے دورِ جدید کا تغزل معلوم ہوتا ہے۔۴۴
- اُن کے ہاں جذبات و وارداتِ عشق کے نہایت دل کش، مؤثر مرقعے ملتے ہیں جن میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، اور جن میں ایک طرح کا ترنّم اور جوش بھی موجود ہے۔

اپنی اس رائے کی تائید میں جلیلؔ قدوائی نے دیوانِ بیدارؔ سے کافی مثالیں پیش کی ہیں یہاں اختصار کے پیشِ نظر صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے:

اتنا تو وہ نہیں ہے کہ بیدارؔ دیجے دل
کیا جانے پیاری اس کی تجھے کیا ادا لگی

حاشیے میں جلیلؔ قدوائی نے بیدارؔ کے اس شعر کا موازنہ سوداؔ کے درج ذیل شعر سے کیا ہے:

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تونے اسے کس آن میں دیکھا

لیکن انصاف شرط ہے، بیدارؔ کا شعر بھی کسی طرح اس سے کم درجہ پر نہیں رکھ سکتے۔''۴۵

- اُن کے کلام میں بہ حیثیت مجموعی ایک طرح کی رنگینی و شادابی پائی جاتی ہے جو کم از کم میرؔ اور دردؔ کے ہاں عام طور پر نہیں پائی جاتی۔ یہ خوبی زیادہ قابلِ قدر اس لیے ہے کہ بعض جگہ مضامین کے اعتبار سے ایسی رنگینی پیدا کرنا محال نظر آتا ہے۔ یہ بات کچھ تو لطیف و نادر تشبیہات سے پیدا ہوئی

ہے اور کچھ عام اسلوبِ ادا اور رنگِ طبیعت کی وجہ سے۔[۴۶] لطیف و رنگین تشبیہات کے پردے میں اور اپنے رنگ طبیعت کی وجہ سے وہ کہیں کہیں ایسے دقیق مسائل اور وسیع خیالات نظم کر جاتے ہیں جن کی تشریح و تحلیل کے لیے دفتر کے دفتر چاہئیں۔ اس حیثیت سے ان کے معاصرین میں سے بہ استثنائے میر دوسرے شعرا شاید اُن کے مقابلے میں مشکل سے لائے جا سکتے ہیں۔''[۴۷]

- ان کے دیوان میں تلاش سے کہیں کہیں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن میں کوئی ایسا مفرد قائم بالذات مضمون نظم کیا گیا ہو جن میں دنیا یا زمانے کے متعلق کوئی اہم حقیقت، کوئی اٹل صداقت بیان کی گئی ہو، حیات کے کسی ایک رُخ کی تفسیر، زندگی سے متعلق کوئی ایسا اہم نکتہ، کوئی راز جس کی کھٹک سے انسانی دل بے چین ہو اور وہ شعر یا مضمون اس بے چینی کی خلشوں کو مٹائے یا کم از کم انسان کو اس مسئلہ پر غور انگیزی ہی کا موقع بخشے ایسے مضامین سے ہمارے قدیم شعرا کے دیوان خالی ہیں اور یہ فلسفۂ حیات کی تفسیر جدید شاعری کا موضوع ہے جس کی ابتدا غالب سے ہوئی ہے۔[۴۸]
- کہیں کہیں لطیف اور سنجیدہ قسم کی ظرافت کی مثالیں بھی ملتی ہیں جو بیدار کے ہم عصروں میں بہ استثنائے سودا جن پر ہجو گوئی کا کمال ختم ہو گیا کم یاب ہیں۔ اُردو شاعری میں ابتدا ہی سے 'طنزیات' کے معنی بے ہودہ مذاق اور پھکڑ کے سمجھے گئے ہیں اور شیخ اور زاہد کی جانیں اُن سے ابد تک محفوظ نظر نہیں آتیں۔ یہ موضوع اس قدر فرسودہ ہو گیا ہے کہ اب اس کے ذکر سے بھی اذیت ہوتی ہے لیکن بیدار کے ہاں یہ مذاق ایسا معتدل رنگ لیے ہے جس سے طبیعت کو انقباض اور تنفر کے بجائے ہلکا ہلکا سرور و کیف حاصل ہوتا ہے۔[۴۹]
- بایں ہمہ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بیدار کے کلام میں کمزوریاں نہیں ہیں اور ان کا دیوان شروع سے آخر تک اسی طرح کے ہموار اور انتخابی اشعار سے بھرا پڑا ہے۔ بیدار کے دیوان میں ابہام، رعایتِ لفظی، عامیانہ جذبات نگاری اور بے مزہ اشعار کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ بیدار کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب کہ اُردو شاعری کی ابتدا تھی۔ اس لیے ہم بیدار کو معذور سمجھتے ہیں اور انھیں ان کی کمزوریوں کے لیے معاف کر سکتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ان کے کلام کا بہت بڑا حصہ ایسے رنگ کا سرمایہ دار ہے جس میں حقیقی شاعری کی روح موجود ہے اور جو اپنی دل کشی اور مرغوبی کی وجہ سے اُن کے نام اور کام کو بقائے دوام بخش سکتا ہے۔[۵۰]

جلیل قدوائی نے چھ نکات پر مشتمل کلام بیدار پر جو سیر حاصل تنقیدی تبصرہ کیا ہے وہ ان کی ناقدانہ

بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کلامِ بیدارؔ پر آپ کے نقد کا خلاصہ نکات وار پیش کیا گیا۔

علاوہ ازیں بیدارؔ کے درد سے تلمذ رکھنے کے بارے میں جلیلؔ قدوائی نے ۱۹۳۲ء میں جو درج ذیل رائے دی تھی کہ: ''۰۰۰ جہاں تک قوی روایات کا تعلق ہے غالباً اس بات کو مان لینا چاہیے کہ بیدارؔ اُردو میں خواجہ میر درد کے شاگرد تھے''۔ ۵۱

اس رائے پر موجودہ عہد کے ممتاز ادبی مؤرخ اور محقق نقاد جناب ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی مہر تصدیق ثبت کی ہے، چناں چہ اپنی ''تاریخ ادب اُردو'' میں آپ لکھتے ہیں کہ: ''بیدارؔ ۰۰۰ اُردو میں خواجہ میر درد کے شاگرد تھے''۔ ۵۲

الغرض یہ مقدمہ جلیلؔ قدوائی کی تحقیق وتنقید کی قابلِ ذکر مثال ہے۔ اس میں تلاش وجستجو، پیرایۂ بیان، اندازِ نقد ونگارش، اُصولِ تحقیق وحوالہ نگاری اور داخلی وخارجی شہادتوں سے بھرپور استفادے کا بخوبی اظہار ہوا ہے۔ علاوہ ازیں مقدمۂ ''دیوانِ بیدارؔ'' جلیلؔ قدوائی کی متوازن روشِ انتقاد، اُن کے اعلیٰ تحقیقی روّیے اور سنجیدہ مطالعے کا عکّاس ہے۔ نیز اس کی ترتیب وتدوین سے جلیلؔ قدوائی ایک ماہر متنی نقاد کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

اب آخر میں کلامِ بیدارؔ پر جلیلؔ قدوائی کی تنقید کے حوالے سے مجنوں گورکھپوری کے ''ایک الزام'' کا تحقیقی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ بیدارؔ پر اپنی ایک تحریر میں فاضل نقاد نے جہاں جلیلؔ کی تحقیقی کاوشوں کو سراہا ہے وہیں ان پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ انھیں بیدارؔ کے ساتھ کچھ غلو ہے۔ محولہ ومتعلقہ تحریر کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''۰۰۰ 'ہندوستانی' بابت جنوری ۱۹۳۲ء میں ہمارے دوست جناب جلیلؔ احمد قدوائی نے بیدارؔ پر ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں بیدارؔ اور کلامِ بیدارؔ سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ ۰۰۰ بیدارؔ کی زندگی کے جتنے حالات میسّر آسکے ہیں انھوں نے اس کے اکٹھا کر دینے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ہے۔ ۰۰۰ مجھے جلیلؔ صاحب کی طرح بیدارؔ کے ساتھ اتنا غلو نہیں کہ ان کے کلام کے مقابلے میں یقینؔ کے اشعار روکھے پھیکے اور کمزور معلوم ہونے لگیں۔ یہ اپنا اپنا ذوق اور اپنا اپنا احساس ہے۔''۵۳

اس اقتباس میں مجنوںؔ نے دو باتیں پیش کی ہیں۔ بیدارؔ کے سوانح کی فراہمی کے سلسلے میں جلیلؔ قدوائی کی تحقیق۔ کلامِ بیدارؔ پر جلیلؔ کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے الزامی جواب۔ چناں چہ ذیل میں مجنوں گورکھپوری کے مذکورہ الزام کا تحقیقی جائزہ لیا جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا کہ ''کلامِ بیدارؔ'' کے متعلق ایک اہم مضمون مجنوں گورکھپوری کا بھی شائع ہوا تھا۔ جو بعد میں ان کے ایک مجموعۂ مضامین ''نقوش وافکار'' میں بھی شریک ہے۔ راقم کے سامنے یہی مجموعہ ہے۔ اس مضمون میں آپ نے بعض اُمور کے سلسلے میں مولانا حسرتؔ موہانی، جلیلؔ قدوائی اور نیاز فتح پوری

سے اختلاف کیا ہے۔

چناں چہ ذیل میں مذکورہ معترضہ اُمور بالترتیب نکات کی صورت میں پیش کیے جاتے ہیں:

۱) ''اُردوے معلّٰی'' بابت مئی جون ۱۹۲۵ء میں مولانا حسرت موہانی نے بیدارؔ کو کس بنا پر حاتم کا شاگرد شمار کیا ہے؟

۲) بیدارؔ کے رنگ شاعری کی بابت جلیلؔ قدوائی نے غلو سے کام لیا ہے۔

۳) مجھے نیاز صاحب کی رائے ماننے میں بھی تامّل ہے جو انھوں نے ''نگار'' بابت جنوری ۱۹۳۵ء میں اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ کرتے ہوئے ظاہر کی ہے کہ ''کوئی خاص بات ان [بیدارؔ] کے کلام میں نہیں''۔

اب ذیل میں مندرجہ بالا اُمور کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

۱) مجنوں گورکھپوری کا یہ اعتراض بجا ہے کہ مولانا حسرت موہانی نے کسی ثبوت کے بغیر بیدارؔ کو حاتمؔ کا شاگرد بتایا ہے۔

اس سلسلے میں مولانا حسرتؔ کا پہلا بیان تو 'اُردوے معلّٰی' علی گڑھ بابت دسمبر ۱۹۰۳ء (جلد ۱، شمارہ ۴) میں یوں سامنے آیا:

''فارسی میں مرتضیٰ قلی خاں فراقؔ کے شاگرد تھے اور اُردو میں شاہ حاتم سے اصلاح لیتے تھے۔''[۵۴]

علاوہ ازیں مذکورہ سلسلے میں ایک اور تاریخی دستاویز بعنوان ''انتخاب سخن'' راقم الحروف کے سامنے ہے، جس میں مولانا حسرت موہانی نے بیدارؔ کو حاتمؔ کا شاگرد ظاہر کیا ہے۔[۵۵] مگر جس کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔ مذکورہ انتخاب میں شامل ''انتخابِ دیوانِ بیدارؔ'' بھی راقم الحروف کے پیشِ نظر ہے جو ''انتخابِ سخن'' ہی کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے، جس میں حسرت نے دیوان بیدار سے ۳۱۶، اشعار کا انتخاب پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس کے آخر میں حاتمؔ کے تلامذہ کا جو شجرہ دیا ہے اُس میں سوداؔ، بقاؔ، تاباںؔ اور بیدارؔ کو سلسلۂ شاہ حاتم ہی میں ظاہر کیا گیا ہے۔

محمد حسین محوی لکھنوی نے اپنے مرتبہ ''دیوان بیدار'' (مطبوعہ ۱۹۳۵ء، مدراس) کے مقدمے میں اس امر پر قدرے مفصل روشنی ڈالی ہے۔ ان کے نزدیک بیدارؔ کو حاتم کا شاگرد قرار دینے کا ماخذ مندرجہ ذیل ہے:

''حاتمؔ کا نام صرف 'خمخانۂ' میں اور بہ روایت ضعیف 'تاریخ ادب اُردو' میں نظر آتا ہے۔ مگر کوئی حوالہ نہیں ہے۔ نہیں معلوم کس وثوق پر لکھا ہے۔ غالباً قابلِ اعتماد نہ ہونے کی وجہ سے 'گلِ رعنا' نے اس کو

نہیں لیا۔۔۔اس لیے ہم کہتے ہیں کہ فراقؔ [مرتضیٰ قلی خاں فراق] تو یقیناً طور پر بیدارؔ کے استاد تھے، دردؔ کا بھی امکان و قرینہ اور شواہد ہیں، باقی تینوں حاتمؔ، اثرؔ [درد کے بھائی]، فراقؔ [ثناء اللہ فراقؔ] کا استاد ہونا غیر یقینی بلکہ غلط معلوم ہوتا ہے۔''۵۶

چناں چہ اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ مولانا حسرت کے مذکورہ صدر اوّل بیان کو 'خمانۂ جاوید'۵۷ اور بعض دیگر مؤرخوں نے نقل در نقل آگے بڑھایا ہے۔ بیدار کے حاتمؔ سے تلمذ کی بابت شاید اسی غلط روایت کے پیشِ نظر ہی جلیل نے دیوانِ بیدار کے اپنے مقدمے میں ذکر نہیں کیا۔ اب مجنوں کے دوسرے اعتراض کا جائزہ لیا جاتا ہے:

۲۔ مجنوں گورکھپوری نے کلام بیدارؔ کی بابت جلیلؔ قدوائی کی تنقیدی رائے کو غلو قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''مجھے جلیلؔ صاحب کی طرح بیدارؔ کے ساتھ اتنا غلو نہیں کہ ان کے کلام کے مقابلے میں یقینؔ کے اشعار 'روکھے پھیکے اور کمزور معلوم ہونے لگیں۔ یہ اپنا اپنا ذوق اور اپنا اپنا احساس ہے۔ میں اپنے مطالعے سے جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ یقینؔ کا کلام اور جو کچھ بھی ہو روکھا پھیکا کبھی نہیں ہوتا۔ یقین کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت گرمی اور شوریدگی ہے جو کسی وقت بھی ان سے علاحدہ ہوتی نظر نہیں آتی۔''۵۸

مجنوں گورکھ پوری نے کلامِ بیدارؔ کے بارے میں قریب قریب اسی رائے کا اظہار کیا ہے جو جلیلؔ قدوائی نے دی ہے البتہ ''یقینؔ'' کے بارے میں کچھ اختلاف ضرور نظر آتا ہے جس کا انھوں نے مختصر تقابلی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ اگر مجنوں کی رائے پر غور کیا جائے تو جلیلؔ کی رائے کم از کم غلو کے دائرے میں نہیں آتی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ طرزِ احساس اور اظہارِ بیان کی نزاکتوں کے ماعث ان دونوں کی تنقیدی رائے بظاہر مختلف دکھائی دیتی ہیں۔ مجنوں کے بیان سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''۔۔۔میں ایک مرتبہ اور کہیں اظہار کر چکا ہوں ان کے [یقینؔ کے] وہاں ایک قسم کی تھکا دینے والی یکسانی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ شاید اسی احساس کو جلیلؔ صاحب نے پھیکے پن سے تعبیر کیا ہے لیکن جوانی کی شورش ایسی ہی ہوتی ہے۔۔۔یقین اور بیدارؔ میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ یقینؔ کے کسی شعر پر کسی اور شاعر کا دھوکا نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے بیدارؔ کے کلام میں اسی دور کے اور شعراء کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ مثلاً حاتمؔ، ہدایتؔ، فراقؔ وغیرہ کی۔''۵۹

کلامِ بیدارؔ کی بابت جلیلؔ قدوائی اور مجنوں گورکھپوری کے اختلاف رائے کی حقیقت جاننے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ناقدین کی آرا کا قدرے تفصیل سے موازنہ کیا جائے۔ چناں چہ ذیل میں اس کا

تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ جلیل قدوائی نے کلامِ بیدار کی بابت اپنی تنقیدی رائے سب سے پہلے جنوری ۱۹۳۲ء میں پیش کی تھی چوں کہ یہی اشاعت مجنوں کے پیش نظر تھی، لہٰذا راقم نے بھی اسی اشاعت کو پیشِ نظر رکھا ہے:

مجنوں گورکھپوری		جلیل قدوائی
بیدار کے یہاں بھی وہ تمام خصوصیات یکجا ہیں جو اس دور تغزل کا طرۂ امتیاز ہیں۔ اس دور کی ایک عمومی شان یہ ہے غزل کا دائرہ زیادہ تر عشق اور وہ بھی اس کے داخلی پہلو تک محدود ہے اور جذبات و واردات سے باہر شاعر بہت کم کسی چیز سے سروکار رکھتا ہے ••• بیدار کی شاعری میں یہی خصوصیات حاوی اور نمایاں ہیں۔	☆	بیدار کے کلام کی عام خصوصیات کم وبیش وہی ہیں جو میر و مرزا اور ان کے معاصر شعرا کے ہاں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً زبان کی صفائی، دل کش و دل پذیر محاورات، ندرت بیان، معتدل حد تک تشبیہ و استعارہ کا استعمال، سوز و اثر وغیرہ۔
بیدار کا رنگ کافی حد تک تقلیدی ہے اور وہ اپنے معاصرین میں مل جاتے ہیں۔	☆	ان کے کلام کا ایک معتد بہ حصہ خواجہ میر درد کے رنگ میں ہے اور بعض غزلیں تو شروع سے آخر تک مسلسل تصوف و اخلاق کے مضامین سے لبریز ہیں۔
بیدار میں وہ تمام امتیازی خصوصیات مجتمع نظر آئیں گی جن کو صرف اس دور سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے دور کی پوری نمائندگی کرتے ہیں۔ قائم، یقین، اثر، تاباں وغیرہ سے بیدار کا مقابلہ کیا جائے تو ان کے کلام میں وہ ٹھہراؤ محسوس ہوگا جو صرف عمر اور تجربے سے نصیب ہوتا ہے۔	☆	ان کے اشعار میں میر و مرزا اور ایک حد تک خود خواجہ میر درد کے مقابلے میں اندازِ بیان کا لطف اور صفائی زبان کا مزہ زیادہ پایا جاتا ہے۔ اور اس حیثیت سے اُن کا کلام اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ بعض بعض جگہ ڈیڑھ دو سو برس پرانا ہونے کے بجائے دورِ جدید کا تغزل معلوم ہوتا ہے۔
بیدار کے دیوان میں ہر قسم کے اشعار ملتے ہیں۔ اخلاق و تصوف بھی موجود ہیں۔ جن میں درد کا تتبع کیا گیا ہے۔	☆	اُن کے ہاں جذبات و واردات عشق کے نہایت دل کش و مؤثر مرقعے ملتے ہیں۔ جن میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، اور جن میں ایک طرح کا ترنم اور جوش بھی موجود ہے۔

ان کا اصلی رنگ وہی تغزل ہے جس کا دائرہ موضوعات و ارادات عشق تک محدود ہے اور جو اس دور کا خمیر ہے۔	☆	اُن کے کلام میں بحیثیت مجموعی ایک طرح کی رنگینی وشادابی پائی جاتی ہے جو کم از کم میر اور درد کے ہاں عام طور پر نہیں پائی جاتی۔ یہ خوبی زیادہ قابلِ قدر اس لیے ہے کہ بعض جگہ مضامین کے اعتبار سے ایسی رنگینی پیدا کرنا محال نظر آتا ہے۔ یہ بات کچھ تو لطیف و نادر تشبیہات سے پیدا ہوئی ہے اور کچھ عام اسلوبِ ادا اور رنگِ طبیعت کی وجہ سے۔
یہ سچ ہے کہ ان کا رنگ تقلیدی ہے لیکن اس تقلیدی رنگ کو انھوں نے کمال کے درجے تک پہنچایا اور اس میں نام پیدا کیا۔ جذبات کی لطافت و گداختگی، معنی کی نزاکت و پاکیزگی اسلوب کا کیف، زبان کا ستھرا پن، غرض کیا ہے جو بیدار کے وہاں نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو میر اور درد کے تیور کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔[۶۰]	☆	اور لطیف و رنگین تشبیہات کے پردے میں اور اپنے رنگِ طبیعت کی وجہ سے وہ کہیں کہیں ایسے دقیق مسائل اور وسیع خیالات نظم کر جاتے ہیں جن کی تشریح و تحلیل کے لیے دفتر کے دفتر چاہئیں۔ اس حیثیت سے ان کے معاصرین میں سے بہ استثنائے میر دوسرے شعرا شاید اُن کے مقابل مشکل سے لائے جا سکتے ہیں۔[۶۱]

کلامِ بیدار پر دونوں ناقدین کے تنقیدی خیالات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ کلامِ بیدار کی بابت جلیل قدوائی اور مجنوں کی رائیں بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں صرف یقین کے مقابلے میں کلامِ بیدار کی بابت مجنوں الگ دکھائی دیتے ہیں۔ جلیل قدوائی نے چوں کہ زیادہ دل چسپی، توجہ اور تقابل سے کام لیا ہے لہٰذا اُن کی رائے اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے۔ ذوقِ نظر اور پسندیدگی کا اختلاف البتہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ اب جلیل قدوائی کے مضمون سے کلامِ بیدار کی بعض کمزوریوں کا بیان کیا جاتا ہے۔ مجنوں کے ہاں کلامِ بیدار کے نقائص پر کچھ اظہار نہیں کیا گیا۔ جب کہ جلیل قدوائی نے کلامِ بیدار کی کمزوریوں کا بیان بھی کیا ہے، چناں چہ اس ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''بایں ہمہ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بیدار کے کلام میں کمزوریاں نہیں ہیں اور اُن کا دیوان شروع سے آخر تک اسی طرح ہموار اور انتخابی اشعار سے بھرا پڑا ہے۔ بیدار کے دیوان میں ابہام، رعایتِ لفظی، عامیانہ جذبات نگاری اور بے مزہ اشعار کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔۔۔ اس معاملے میں اُن کی مثال درد کے خلاف میر کی ہے جن کے ہاں پست و بلند ہر طرح کے اشعار موجود ہیں اور اس

میں کوئی شک نہیں کہ میرؔ کے متعلق آزردہؔ کا جو یہ قول ہے کہ 'پستش بہ غایت پست و بلندش بہ غایت بلند' وہ ایک حد تک یہاں بھی صادق آتا ہے۔''[۶۲]

اس اقتباس کے مندرجات سے ثابت ہوجاتا ہے کہ جلیلؔ قدوائی نے کلامِ بیدارؔ کے دونوں پہلوؤں پر منصفانہ تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ چناں چہ بیدار پر یہ تحقیقی وتنقیدی مضمون جسے بعد میں 'دیوانِ بیدار' کا مقدمہ بھی بنایا گیا تحقیق کے ساتھ ساتھ جلیلؔ کے متوازن اندازِ نقد کی قابلِ ذکر مثال بھی ہے۔ اسی کے ساتھ اس الزام کی حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ جلیلؔ کو بیدار کے ساتھ کچھ غلو تھا۔

اب آخر میں اس بات کا بھی جائزہ پیش کیا جاتا ہے کہ ادبی دنیا میں جلیلؔ قدوائی کے مرتبہ ''دیوانِ بیدارؔ'' کی کس طور سے پذیرائی ہوئی۔

اس ضمن میں ادبی رسائل کے تبصروں کے ساتھ ساتھ بعض مشاہیر اُردو کے خطوط سے بھی اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ ''دیوانِ بیدارؔ'' مرتبہ جلیلؔ قدوائی کی اشاعت کی قابلِ ذکر پذیرائی ہوئی۔ ذیل میں بطور مشتے نمونہ از خروارے ''دیوانِ بیدارؔ'' کی اشاعت کے فوری بعد شائع ہونے والے ایک تبصرے سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ دیوان جولائی ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا اور ذیل کا تبصرہ اگست میں نکلا ہے۔ ''زمانہ'' کانپور اگست ۱۹۳۷ء کا شمارہ راقم کے سامنے ہے۔ اگرچہ تبصرہ نگار کے نام کی صراحت نہیں کی گئی مگر قرینہ بتاتا ہے کہ یہ مدیر ''زمانہ''، دیانرائن نگم بی اے ہی کے قلم سے نکلا ہوگا۔ ذیل میں اس تبصرے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ ''دیوانِ بیدار'' کے کوائف صفحہ ۱۲۸ پر حاشیے میں یوں مذکور ہیں:

[''مرتبہ جلیلؔ احمد صاحب قدوائی۔ ایم۔ اے لکچرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد صفحات ۱۶۷۔ قیمت مجلد دو روپیہ غیر مجلد ۲/۸۔ ملنے کا پتا: کتابستان الٰہ آباد۔'']

''میر محمد علی عرف میر محمدی بیدار دہلوی، میرؔ اور سوداؔ کے ہم عصر تھے۔ ان کا تذکرہ 'نکات الشعراء'، 'تذکرۂ شعرائے اُردو'، 'مخزنِ نکات'، 'چمنستانِ شعرا'، 'شعر الہند'، اور 'گلِ رعنا'، وغیرہ میں موجود ہے۔ لیکن آپ کا دیوان کمیاب ہی نہیں بلکہ نایاب تھا۔ جناب جلیلؔ احمد صاحب قدوائی نے دیوان کی اشاعت کی طرف توجہ کر کے اسلاف پرستی کا نمونہ پیش کیا ہے۔ ابتدا میں جناب جلیلؔ صاحب کا ایک قابلِ قدر مقدمہ ہے اور جگہ جگہ حواشی بھی لکھ دیے گئے ہیں۔ قدیم اُردو تذکرہ نویسوں کے یہاں یہ خاص بات پائی جاتی ہے کہ وہ شعرا کے حالاتِ زندگی درج نہیں کرتے۔ بالخصوص بیدارؔ کے حالاتِ زندگی کے متعلق سب خاموش ہیں۔ اس لیے جلیلؔ صاحب کو حالاتِ زندگی کے فراہم کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آئی ہیں۔ اور بعض جگہ انتہائی کدوکاوش کے بعد بھی صرف قیاس آرائی سے کام لینا پڑا ہے۔ مرتب نے مقدمے کو حتی الامکان جامع بنانے کی

کوشش کی ہے۔ اور دبی زبان سے بیدار کی کمزوریاں بھی گنادی ہیں۔

بیدار کا کلام دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُن پر درد کا کلام خاص طور سے اثر انداز ہوا تھا۔ رنگِ سخن درد سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ اندازِ بیان لطیف اور زبان صاف ہے۔ تصوف کے علاوہ جذبات کی سچی تصویریں اور واردات عشق کے دلکش مرقعے پائے جاتے ہیں۔ لطیف اور نادر تشبیہوں نے بعض جگہ بہت لطف پیدا کر دیا ہے ... بحیثیت مجموعی دیوانِ بیدار اُردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔''۶۳

تبصرہ نگار نے ''دیوانِ بیدار'' سے نمونہ کلام بھی پیش کیا ہے جسے یہاں طوالت کے پیشِ نظر حذف کر دیا گیا ہے۔ اس تبصرے سے جہاں ''دیوانِ بیدار'' کی قدر و قیمت سامنے آتی ہے وہیں جلیل قدوائی کی کاوشوں کی پذیرائی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں راس مسعود کا مکتوب بھی نظر میں رکھنا چاہیے جو انھوں نے ''دیوانِ بیدار'' کی رسید دیتے ہوئے جلیل قدوائی کو تحریر کیا تھا۔۶۴

(ii:1) ''مکتوباتِ عبدالحق''۶۵

مولوی عبدالحق جنھیں اُردو دنیا بابائے اُردو کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے، علی گڑھ کی بہترین پیداوار تھے۔ آپ سرسیّد احمد خان سمیت دیگر اکابرین کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ اُردو سے محبت اور اس کی خدمت آپ کا ایسا حوالہ ہے جس سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کی ترقی میں آپ نے جس قدر اور جس طرح تن تنہا کردار ادا کیا ہے وہ ایک منفرد مثال ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اجتماعی طور پر چوٹی کے علما سے بھی خاطر خواہ کام لیا ہے۔ ان میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، سر راس مسعود، حبیب الرحمٰن خاں شروانی، برج موہن پنڈت دتاتریہ کیفی، قاضی عبدالودود، عابد حُسین، وحیدالدین سلیم، امیر الدین ہاشمی، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، افسر صدیقی، وغیرہم ایسی علمی و ادبی اور تہذیبی شخصیات قابلِ ذکر ہیں۔

مولوی عبدالحق نے اُردو زبان و ادب کی تاریخ کے لیے ایک طرف قدیم شعرائے اُردو کے تذکروں اور صوفیائے کرام کے ملفوظات کو اپنی تحقیق و تنقید کا موضوع بنایا اور انھیں مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ اور دوسری جانب اُردو زبان میں جدید الفاظ کے اضافوں کے لیے کنسائز آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے اُردو ترجمے کے لیے بڑے پیمانے پر کام شروع کیا اور بالآخر ''دی اسٹینڈرڈ انگلش۔ اُردو ڈکشنری'' کی صورت میں اسے اورنگ آباد (دکن) سے شائع کر دیا۔ اس سلسلے میں تفصیلات اپنے مقام پر آئیں گی۔

آپ نے اپنے علمی و ادبی کاموں کے سلسلے میں ہندوستان بھر سے اہلِ علم کو صلاح و مشوروں کے

لیے جو بے شمار خطوط لکھے انھیں بابائے اُردو کی نو د سالہ جوبلی ٦٦ کے سلسلے میں مشفق خواجہ اور جلیل قدوائی کی کوششوں سے تحریک پاتے ہوئے مختلف اہلِ علم نے وقتاً فوقتاً متعدد مجموعوں کی صورت میں یکجا کیا ہے۔ چناں چہ اس ضمن میں جو پیش رفت ہوئی اس کی اجمالی کیفیت حسبِ ذیل ہے:

۱۔ ''اُردوے مصفا'' مرتبہ: ابوتمیم فرید آبادی (۳۶۷ خطوط)

۲۔ ''مکتوباتِ عبدالحق'' مرتبہ: جلیل قدوائی (۵۳۳ خطوط)

۳۔ ''خطوطِ عبدالحق''، مرتبہ: محمد اکبرالدین صدیقی (۲۸۲ خطوط)

۴۔ ''عبدالحق کے خطوط عبدالحق کے نام'' مرتبہ: الحاج افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق (۵۷ خطوط)

۵۔ ''مکتوباتِ بابائے اُردو'' مرتبہ: حکیم محمد امام امامی (۱۱۸ خطوط)

ان مجموعوں کے خطوط علمی، ادبی اور تہذیبی اعتبار سے بھی اہم ہیں۔ آگے بڑھنے سے قبل ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تحریر سے ایک اقتباس ملاحظہ کرتے چلیں جس کے مطالعے سے مولوی عبدالحق کی شخصیت کے بنیادی جوہر نمایاں ہونے کے علاوہ ان کے خطوط کی خصوصیات بھی سامنے آتی ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ رقم طراز ہیں کہ:

> ''مولوی صاحب کو زبان و بیان اور ادائے مطلب پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ ان کے اسلوب کی سادگی، صفائی اور روانی ان خطوں میں بھی موجود ہے۔ جگہ جگہ مولوی صاحب کی پُرخلوص شخصیت الفاظ کے پردوں سے جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، اُردو سے عشق، محنت کی عادت اور مقصد کی لگن۔ مولوی عبدالحق کی شخصیت کے بنیادی جوہر تھے۔ ان خطوط میں یہ اُمور بھی واضح طور پر سامنے آتے ہیں، اور بعض ایسے واقعات کی تفصیل بھی مل جاتی ہے۔ جو مولوی صاحب کے سوانح نگار کے لیے نہایت اہم ہیں''۔٦٧

مذکورہ تمام مجموعوں پر ایک نظر ڈالتے ہی معلوم ہوگا کہ جلیل قدوائی کے مرتبہ ''مکتوبات عبدالحق'' کو ادبی، سوانحی اور علمی لحاظ کے علاوہ اسے ضخامت میں بھی مذکورہ تمام مجموعوں پر فوقیت حاصل ہے۔ اب ذیل میں اس مجموعے کا تحقیقی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

''مکتوباتِ عبدالحق'' مکتبۂ اسلوب کراچی سے ۱۹۶۳ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ جلیل قدوائی کا یہ کام ان کی متنی تنقید میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

۶۸۰ صفحات کے اس مجموعے میں بابائے اُردو کے تحریر کردہ ۵۲/اصحابِ علم و ہنر کے نام ۵۰۰ سے زائد خطوط ہیں جنھیں بڑی محنت، خلوص اور لگن سے جناب جلیل قدوائی نے یکجا کیا ہے۔ اس کے بعد کئی اور مجموعے بھی شائع ہوئے جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، مگر ''مکتوباتِ عبدالحق'' کو جامعیت اور مقبولیت کا جو شرف

حاصل ہوا وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ مولوی عبدالحق نے جن اصحاب کو خطوط لکھے ان میں سے باون (۵۲) شخصیات کے نام خطوط اس مجموعے میں شامل ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

نمبر شمار	مکتوب الیہ	تعداد	نمبر شمار	مکتوب الیہ	تعداد
۱	ڈاکٹر عبدالستار صدیقی	۱۲۴	۲	محمد امین زبیری	۴۲
۳	عبدالماجد دریابادی	۳۷	۴	غلام رسول مہر	۲۷
۵	ڈاکٹر داؤد رہبر ۶۸	۶۸	۶	نصیرالدین ہاشمی	۱۲
۷	ڈاکٹر عابد حسین	۱	۸	میاں بشیر احمد	۲۳
۹	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۸	۱۰	گاندھی جی	۲
۱۱	ابوالکلام آزاد	۱	۱۲	سر تیج بہادر سپرو	۱
۱۳	سر سکندر حیات	۱	۱۴	ڈاکٹر مختار احمد انصاری	۱
۱۵	سخاوت مرزا	۲۴	۱۶	ہاشمی فرید آبادی	۳۳
۱۷	شبیر کاظمی	۲۰	۱۸	ڈاکٹر قطب انساء ہاشمی	۵
۱۹	عزیز احمد	۹	۲۰	شفیع ادبی	۲
۲۱	محمد حسین زبیری	۲	۲۲	بیگم ارجمند قزلباش	۱
۲۳	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں	۲	۲۴	مس آمنہ ممتاز	۱
۲۵	حسن بانو قزلباش	۱۹	۲۶	نصر اللہ خاں	۲
۲۷	ضیاء الدین برنی	۳	۲۸	حکیم محمد امام امامی	۱۷
۲۹	ڈاکٹر رکن الدین قریشی	۸	۳۰	ڈاکٹر غلام محی الدین زور	۱
۳۱	مولوی عمر یافعی	۱	۳۲	دیوان سنگھ مفتون	۱
۳۳	ڈاکٹر عبدالعلیم نامی	۱	۳۴	کبیر احمد جائسی	۱
۳۵	رحیم الدین کمال	۱	۳۶	میاں عبدالحئی	۱
۳۷	مولوی سجاد مرزا	۱	۳۸	محمد منظور	۱

۳۹	جانکی پرشاد، منظور احمد، سجاد مرزا صاحبان	۱	۴۰	سیّد وصی احمد بلگرامی	۱
۴۱	اے کے دُرّانی	۱	۴۲	غلام صابر صدیقی	۱
۴۳	اقبال شیدائی	۴	۴۴	کیپٹن اے آر جڈ	۱
۴۵	اصغر مینائی	۲	۴۶	احمد سیٹھ صاحب	۱
۴۷	وائس چانسلر تہران یونیورسٹی	۱	۴۸	بیگم شائستہ اکرام اللہ	۱
۴۹	صفیہ شمیم	۳	۵۰	صوفیہ اقبال	۱
۵۰	غنیو رازیبا	۱	۵۲	جلیلؔ قدوائی	۸

یہاں ضمناً صراحت کرتے چلیں کہ ''مکتوباتِ عبدالحق'' سے پہلے ''اُردوے مصفّا'' کے نام سے سیّد ابوتمیم فرید آبادی نے ۱۹۶۱ء میں لاہور سے ایک مجموعہ خطوط شائع کیا تھا جس کا تذکرہ کچھ تحقیق طلب ہے کیوں کہ ''اُردوے مصفّا'' کی ترتیب کا بیشتر کام جلیلؔ قدوائی ہی کا کیا ہوا ہے، چناں چہ آخر میں اس امر کا بھی تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

''مکتوباتِ عبدالحق'' کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی ترتیب و تدوین کا آغاز بابائے اُردو کی زندگی میں ہوا۔ اگرچہ اس کی اشاعت بابائے اُردو کے انتقال کے بعد ہوئی۔ بابائے اُردو کے خطوط جمع کرنے کے سلسلے میں ان کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے جناب مشفق خواجہ کو ہزار جتن کرنا پڑے۔ کیوں کہ بابائے اُردو کسی طرح اس کام میں دلچسپی لینے کے لیے تیار نہ تھے۔[۶۹] جلیلؔ قدوائی نے بھی ''عرض مرتب'' میں لکھا ہے کہ:

> ''مشفق خواجہ (مددگار معتمد انجمن ترقی اُردو) نے آخر میں نہ جانے کس طرح مرحوم کو اس کام کی اہمیّت اور افادیت کا یقین دلا کر ان سے ان کے خطوط جمع کرنے کی اجازت حاصل کر لی اور چھ سال کی مسلسل کوشش سے ایک بڑا ذخیرہ جمع کر لیا۔ بابائے اُردو نے خواجہ صاحب کے علاوہ نہ صرف کسی دوسرے شخص کو اپنے خطوط جمع کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ ان کی مدد بھی کی ••• میں بے حد ممنون ہوں کہ اس مجموعے کی تالیف کے وقت میری درخواست پر خواجہ صاحب نے اپنے ذخیرے کا ایک حصّہ مجھے عنایت کر دیا''۔[۷۰]

''عرض مرتّب'' سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس علمی منصوبے پر جناب مشفق خواجہ کی چھ سال کی مسلسل کوششیں صرف ہوئیں ہیں۔ لیکن چوں کہ جلیلؔ قدوائی بابائے اُردو کے نود سالہ جشن کے سلسلے میں قائم ہونے والی کمیٹی

کے سیکریٹری تھے لہٰذا آپ نے اس سلسلے میں بہت سے خطوط براہِ راست بھی حاصل کیے۔ ان تمام خطوط کو آپ نے نہایت سلیقے سے اپنے حواشی اور مقدمے کے ساتھ مُرتّب و مُدوّن کر کے شائع کیا ہے۔

ذیل میں ان مکتوبات کی جمع آوری اور دیگر خصوصیات کے جائزے کے ساتھ ساتھ مقدمے کے تنقیدی و تحقیقی پہلو کا تجزیہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔

مقدّمہ

اس مقدّمے کا آغاز ایک مؤثر انداز کی تمہید سے ہوتا ہے جس میں بابائے اُردو کی بعض اہم ترین جہات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ جلیلؔ قدوائی کے خیال میں: ''بابائے اُردو کو صرف ایک مصنّف، مؤلف یا اہلِ قلم کی حیثیت سے جانچنا اُن کے مرتبے کو گھٹانا یا اُن کی قدر و قیمت کو گرانا ہی نہیں، اُن کے مرتبے اور ان کی حقیقی قدر و قیمت سے ناواقفیت کا بھی ثبوت دینا ہے''۔ ۱؎

اس کے بعد آپ نے وہ تفصیلات بھی فراہم کی ہیں جس کے پیشِ نظر بابائے اُردو کی شخصیّت کو جانچنا اور پرکھنا چاہیے۔ چناں چہ آپ کے نزدیک انھیں سب سے زیادہ ایک عظیم الشّان ثقافتی تحریک کے علم بردار، ایک بڑے قومی کارکن، اُردو زبان کے ایک زبردست خدمت گزار، محقق، مبلّغ، محافظ اور مشتہر کی حیثیت سے جانچنا چاہیے۔ ۲؎

بابائے اُردو کی ان جہتوں کو اجمالاً نمایاں کرنے کے بعد جلیلؔ قدوائی نے ان پر متعدد اعتراضات کا بھی نہ صرف کامیابی سے دفاع کیا ہے بلکہ اس ضمن میں بعض مثالوں سے ان بیانات کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس مقدّمے میں بعض اہم موضوعات اور ان سے متعلق اپنے زمانے کی سربرآوردہ شخصیات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

اُردو کی ترقی اور بقا کے ساتھ ساتھ اس کے تحفظ کے لیے بابائے اُردو نے گاندھی جی، سر سکندر حیات، ڈاکٹر انصاری، میاں بشیر احمد، مولانا ابوالکلام آزاد اور سر تیج بہادر سپرو سے جو مراسلت کی تھی ان خطوط کے حوالے سے بھی جلیلؔ قدوائی نے اپنے مقدمے میں روشنی ڈالی ہے۔ جب کہ ادبی شخصیّات میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، سیّد ہاشمی فرید آبادی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولوی محمد امین زبیری، مولوی نصیرالدین ہاشمی، مولوی سخاوت مرزا اور ڈاکٹر داؤد رہبر کے نام خطوط کا خصوصیّت سے ذکر ہوا ہے۔ اس تذکرے میں جلیلؔ قدوائی کا قلم خوب جولانی دکھاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے بابائے اُردو کے قلمی رابطوں، علمی معاونت، اخذ و استفادہ اور صلاح و مشوروں کی بابت جلیلؔ قدوائی لکھتے ہیں:

''علم و ادب کے دو بوڑھوں کا یہ ربط و تعلق دیدنی ہے جو کچھ عرصے کے بعد شنیدنی بن جائے گا۔ اس لیے

کہ اب زمانے نے ایسے باوضع اور مخلص انسان بنانے والے سانچے توڑ ڈالے ہیں''۔۳؎

جلیل قدوائی نے بابائے اُردو کے انداز تخاطب، القاب وآداب نیز ان کے بے تکلف دوستوں اوراحباب کا ذکر خیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''جہاں تک دل کی لگی اور بھید بھاؤ کا تعلق ہے، بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ سیّد ہاشمی صاحب سے بہتر بابائے اُردو کا کوئی رفیق اور عزیز نہیں۔ ہاشمی صاحب کو وہ 'تم' اور 'عزیزی' سے مخاطب کرتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ رسمی اور مقررہ طرزِ خطاب اختیار کرتے ہیں''۔۴؎

بابائے اُردو کی مکتوب نگاری کی مذکورہ خصوصیات کے حامل خطوط سے دو اقتباسات ذیل میں مشتے نمونہ از خروارے پیش کیے جاتے ہیں جن سے ایک طرف تو ان خطوط کی ادبیت کا اندازہ ہوگا اور دوسری جانب بابائے اُردو کی مکتوب نگاری کی بابت جلیل قدوائی کی تنقیدی اور تجزیاتی رائے کا اندازہ بھی ہو سکے گا۔ ملاحظہ ہو:

اقتباس اول: از مکتوبِ مولوی عبدالحق بنام مولوی محمد امین زبیری مرحوم۵؎

''چلتی ریل میں سے

۱۱۔نومبر ۱۹۳۷ء

میرے مشفق اور مہربان

یہ خط میں چلتی ریل میں سے لکھ رہا ہوں۔ تم جانتے ہو میں نے ریل میں کئی اچھی چیزیں لکھی ہیں۔ عید کی تعطیلوں میں اورنگ آباد گیا تھا۔ سب تو نہیں لیکن بہت سا کام جو میں لے کر آیا تھا، یہاں اطمینان سے بیٹھ کر کرلیا۔ اب الٰہ آباد جارہا ہوں۔ بیگار میں پکڑا گیا ہوں۔ بہت بچنا چاہا نہ بچ سکا۔ خیر ایک تماشہ اور سہی۔۔۔۔تمھارا خط پہنچا تھا۔ ارے میاں کس کس کی شکایت کروگے۔ زمانہ بدل گیا اور بدلتا جاتا ہے اور تم ابھی تک انھیں جھمکوں کو دیکھنا چاہتے ہو جو چالیس برس پہلے دیکھ چکے ہو۔ اب نہ وہ علی گڑھ ہے اور نہ وہ علی گڑھ والے اور نہ وہ بھوپال ہے اور نہ بھوپال والے۔ تم بھوپال جاتے ہو ۱۹۳۷ء میں ۔۔۔ اور سماں تمھاری نظروں میں سمایا ہوا ہے، بیگم صاحب کے زمانے کا، جس دل و دماغ سے اس عہد میں پرورش اور تربیت پائی تھی وہ اس عہد سے میل نہیں کھا سکتا۔ ذرا کسی نے بے رُخی کی اور تم آپے سے باہر ہوگئے۔ ذرا کسی نے قاعدے کی بات کی اور تمھارے تیور بدلے۔ قاعدے بدل گئے، قانون بدل گئے۔ زمانہ بدل گیا۔ حکومتیں بدل گئیں۔ آسمان زمین بدل گئے اور تم ہو کہ اپنی جگہ پر اٹل کھڑے ہو اور چاہتے ہو کہ دنیا تمھارے گرد گھومے۔ کیا تم یہ نہیں جانتے؟ خوب جانتے ہو، لیکن وقت پر بھول جاتے ہو اور چالیس برس پہلے کے خیالات جو دل کے کونے گوشے میں چھپے پڑے دفعتاً اُبھر آتے ہیں اور کام کر جاتے ہیں۔ کام کیا کر جاتے ہیں کام بگاڑ جاتے ہیں۔ تمھاری طرح میں بھی اب حیدرآباد سے جارہا ہوں۔ مجھے بھی وہی مرحلہ پیش آنے والا

ہے جو تمھیں پیش آیا۔ لیکن جب کبھی ایسا موقع آیا تو تمھیں یاد کر لیا کروں گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ تمھاری مثال میرے بہت کام آئے گی۔ پچھلی باتیں بھول جاؤ اور نئے بتوں کے سامنے جھک جاؤ۔ اگر اتنی توفیق نہیں تو سامنے سے چُپ چاپ گزر جاؤ اور اپنی آنکھ، ہاتھ زبان کو قابو میں رکھو۔ اِن کے بتوں کو بُرا نہ کہو، ورنہ تمھارے خدا کو بُرا کہیں گے۔ میں ستمبر کے آخر ہفتے میں سندھ جانے والا ہوں۔ کراچی میں اُردو پراونشل کانفرنس ہے۔ سندھ میں اُردو کا کام کرنا بہت ضروری ہے۔ وقت مِلا تو ایک آدھ روز کے لیے علی گڑھ آن نکلوں گا۔ نیاز مند

عبدالحق"۔٦ے

اقتباس دوم: از مکتوب عبدالحق بنام سیّد ہاشمی فرید آبادی

"اورنگ آباد دکن۔ ۱۱راگست ۱۹۲۶ء

عزیزی۔ ہمارا بے مثل دوست حکیم ۷ے مرگیا۔ افسوس، صد افسوس! وہ اپنے فن اور رنگ میں اکیلا تھا۔ اگر چہ ہمّت کا کمزور اور لااُبالی تھا مگر دوستی کا سچّا اور دُھن کا پکّا۔ یہ سچ ہے کہ وہ دنیا کے کام کا نہ تھا۔ خیال میں اس نے ایک ایسا عالم بنا رکھا تھا کہ عالم مثال بھی اس کے سامنے ہیچ تھا۔ اس میں ہر بات انتہائی تھی۔ محبت تھی تو انتہا درجہ کی، عداوت تھی تو انتہا درجہ کی۔ میانہ روی سے وہ بالکل ناآشنا تھا۔ قدامت اور جدّت عجب طرح سے اس کے مزاج میں سموئی ہوئی تھی۔ قدامت ایسی کہ اچھے اچھے پُرانے لوگ اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے تھے اور جدّت ایسی کہ نئی روشنی کے ستارے بھی اس کے آگے ماند تھے۔

وہ اپنے خیال میں آزاد، مطلق العنان اور اپنی طبیعت کا بادشاہ تھا۔ وہ بہت کچھ کر سکتا تھا مگر اس کی ساری کائنات عالمِ خیال میں تھی جو کبھی شرمندۂ عمل نہ ہوئی۔ اس کا شغل اس قدر بلند تھا کہ فہم وہاں پہنچتے پہنچتے لڑکھڑانے لگتا تھا۔ شعر کا شوق ایسا پاکیزہ اور اعلیٰ درجے کا تھا کہ میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔..... جس قدر جلد وہ بگڑ جاتا تھا اسی قدر جلد خوش بھی ہو جاتا تھا۔ اس کی باتیں، اس کی چال ڈھال، اس کی ہیئت، اس کی طرزِ معاشرت، اس کا برتاؤ سب پُرانے تھے اور سب میں لااُبالی پن پایا جاتا تھا۔ وہ سوائے اپنے خیال کے کسی چیز کا پابند نہ تھا مگر پرلے درجے کا خوددار بھی تھا۔ وہ اپنے فن میں باکمال تھا اس کی حذاقت مسلّم تھی۔ وہ طبیب ہی نہ تھا حکیم بھی تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ وقت پر وہ کام کر جاتا جو بڑے بڑے حاذق طبیب اور ڈاکٹر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ غریبوں کا غم خوار اور دوستوں کا ہم درد تھا۔ افسوس کہ حیدرآباد ایک ایسی ذات سے خالی ہو گیا جس کی نظیر اب نہیں ہے۔ لوگ اسے بہت یاد کریں گے۔ احباب کے جلسے اس کے بغیر سونے ہوں گے۔ وہ اپنی ذات سے اک انجمن تھا۔ اور سب سے زیادہ اس کے غریب دوست اس کا ماتم کریں گے۔

عبدالحق"۔۸ے

ان مثالوں کو ملاحظہ کرنے کے بعد جلیلؔ قدوائی کی رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ جو انھوں نے بابائے اُردو کی خط نگاری کے سلسلے میں ظاہر کی ہے اگر دیکھا جائے تو جلیلؔ قدوائی نے اپنے اس مقدّمے میں بابائے اُردو کی سیرت وسوانح کے ایسے ایسے پہلوؤں کا نشان پتا دیا ہے کہ اُن کا سوانح نگار اس سے بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

پیشِ نظر مقدّمے کا وہ حصّہ یقیناً قابلِ قدر ہے جس میں انھوں نے بابائے اُردو کی خط نویسی کا موازنہ غالبؔ، ابوالکلام آزادؔ اور نیازؔ فتح پوری سے کیا ہے۔ بابائے اُردو کی نثر میں آمد سخن کے ساتھ ساتھ اُن کا محاورات اور روزمرّہ کے برجستہ استعمال کے ضمن میں مولوی نذیر احمد، اور مولانا حالیؔ سے بھی مقابلہ کیا ہے۔ یہاں غالبؔ سے موازنے کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

> ''غالبؔ کو اُردو خط نویسی بالخصوص مراسلے کو مکالمہ بنا دینے والی خط نویسی کا بابا آدم سمجھا جاتا ہے، جن پر اس فن کا کمال ختم بھی ہو گیا مگر اہلِ نظر اس امر سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ غالبؔ بھی کہیں کہیں اپج پیچ سے کام لیتے ہیں اور اُن کے بعض خطوط کی برجستگی میں بھی اہتمام اور آورد کا دخل پایا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ غالبؔ نے خط نویسی کو ایک فن کی حیثیت سے اختیار کیا تھا اور کیا تعجب کہ برجستگی کی بھی نوک پلک درست کرتے ہوں''۔۷۹

اس اقتباس میں غالبؔ کے فن کو تسلیم کرنے کے باوجود ان کے بعض خطوط کی برجستگی میں کلام کیا گیا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو جلیلؔ قدوائی کا یہ بیان محض غالب شکنی کے شوق کا عکّاس نہیں ہے بلکہ نھوں نے اپنا مؤقف دلائل کے ساتھ پیش کرتے ہوئے حقیقتِ حال کا اظہار کیا ہے۔ علاوہ ازیں غالب کے خطوط کے سلسلے میں انھوں نے بعض قرین قیاس امکانات کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً غالبؔ:

> ''اپنے احباب کو خاص اہتمام سے خط لکھتے تھے اور اپنی نوطرز کی اُن سے داد بھی طلب کرتے تھے، اُنھیں خط لکھتے وقت نہ صرف اس امر کا احساس رہتا تھا کہ وہ شائع کیے جائیں گے یا شائع کیے جانے چاہیں بلکہ معلوم ہے کہ انھوں نے خود ہی اپنے احباب سے لے کر اُنھیں جمع بھی کیا تھا۔ کیا جانے اُن پر نظرِ ثانی بھی کی ہو''۔۸۰

اس اقتباس میں جن امکانات کا اظہار کیا گیا ہے وہ پیش کیے گئے دلائل کی روشنی میں فوری رد بھی نہیں کیے جا سکتے بلکہ اس پہلو کے نتائج جلیلؔ قدوائی کے مؤقف کی تائید ہی کرتے ہیں۔

بابائے اُردو کی مکتوب نگاری کے سلسلے میں جلیلؔ قدوائی کی تنقیدی اور تحقیقی رائے یہ ہے کہ:

> ''اُن کے ایک خط میں بھی آورد نہیں پائی جاتی۔ وہ اپنے مکتوب الیہ کو براہِ راست مخاطب کرتے ہیں۔ سیدھی سادی معاملے کی باتیں ہیں جو سیدھی سادی اور بامحاورہ زبان میں ادا کی گئی ہیں اور

بس۔ اور جہاں معاملہ ختم ہوا خط بھی ختم ہوگیا۔۔۔۔ محاورے اور روزمرہ کا جو چٹخارا بابائے اُردو کے ہاں ملتا ہے، غالب کے ہاں باوصف برجستگی و شگفتگی اس کا دور دور پتا نہیں اور بعد کے خط نویسوں مثلاً: ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری کے ہاں تو اس کی توقع ہی فضول ہے اس لیے کہ یہ دونوں بزرگ اہتمام اور آورد کے امام ہیں"۔[۸۱]

مندرجہ بالا مقتبس عبارت جلیل قدوائی کی زبان و بیان پر گہری نظر، استخراج نتائج میں آزادانہ روّیہ جو کسی بڑی سے بڑی علمی اور ادبی شخصیت سے بھی مرعوب نہ ہونے کے وصف پر مشتمل ہے، قابلِ توجہ ہے۔

آپ کی یہ رائے بابائے اُردو کے خطوط کے گہرے مطالعے اور تجزیے کے ساتھ ساتھ خطوط نویسی کے تاریخی رجحان کے مابین اہم موازنے پر بھی مشتمل ہے۔

اپنی اس رائے سے جلیل قدوائی کو غالب کے فن پر یا دیگر سربرآوردہ ادبی شخصیات پر رسمی اعتراض مقصود نہیں، بلکہ اُردو کی ایک اور بڑی شخصیت کے قابلِ قدر فن کے اہم پہلو کو واضح کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ جلیل قدوائی نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بابائے اُردو کے خطوط میں محاورے اور روزمرّہ کے برجستہ استعمال کی خوبی کو بھی موازنے سے واضح کیا ہے۔

یہ موازنہ اُردو کے دو بڑے محسن و مربی ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا حالی کے اندازِ بیان سے کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے بابائے اُردو کے خطوط سے اخذ کردہ تیس پینتیس محاوروں کا ڈپٹی نذیر احمد کے اسلوبِ تحریر سے مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "مولوی نذیر احمد کے اسلوب کے برخلاف بابائے اُردو کی عبارت میں یہ قطعی نہیں معلوم ہوتا کہ محاورات خواہ مخواہ یا زبردستی استعمال کیے گئے ہیں یا محض انھیں کام میں لانے کے لیے مضمون کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ اس کے برخلاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف آمدِ سخن اور زورِ بیان کے سلسلے میں بالکل قدرتی طور پر زبانِ قلم سے ٹپک پڑے ہیں اور زبان کی شگفتگی اور فصاحت کا باعث ہوئے ہیں، بلکہ اظہارِ خیال اور ادائے مطلب کے لیے ازبس ضروری تھے۔ شاید ہی کسی اور اہلِ قلم کے ہاں محاورات کی اتنی قدرتی اور جائز بہتات ہو"۔[۸۲]

اس میں کیا شک ہے کہ روزمرّہ اور محاورات کے استعمال کے باعث ڈپٹی نذیر احمد اپنا ایک اسلوب رکھتے ہیں مگر یہ بات بھی اہلِ نظر خوب جانتے ہیں کہ ان کا یہی وصف ان کی تحریر کی روانی کے لیے رکاوٹ بھی بنتا ہے۔ تحریر میں جا و بے جا محاورے بھرتی کرنے کا شوق اُنھیں باعثِ تنقید بھی بناتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے اندازِ تحریر کے اسی پہلو سے جلیل قدوائی نے بابائے اُردو کی تحریر کا قابلِ ذکر موازنہ کیا ہے۔ جلیل قدوائی نے حالی، سرسیّد اور ان کے تمام رفقاء کی نثر نگاری سے بابائے اُردو کی نثر کا اجمالی

موازنہ بھی کیا ہے اور اس موازنے کے بعد انھوں نے بتایا ہے کہ بابائے اُردو کی نثر اپنی روانی اور سادگی میں مذکورہ اصحاب کی نثر پر فضیلت کی حامل ہے۔ یہ نہیں کہ وہ صرف اپنے موکل کی حمایت میں مبالغہ آمیز مبنی برتعصّب اور بے دلیل دعوے کرتے ہوں، بلکہ وہ قابلِ لحاظ دلائل بھی پیش کرتے ہیں اسی لیے وہ اپنے موازنے اور مقابلے میں بے لاگ رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً حالی اور بابائے اُردو کے اندازِ بیان کا موازنہ کرتے ہوئے جلیل قدوائی رقم طراز ہیں کہ:

''محاورات کسی اہلِ قلم کے اندازِ بیان کا جزو ہوتے ہیں اور سادہ، متین اور رواں زبان کے ساتھ خوب چلتے ہیں۔ بابائے اُردو زبان کی متانت کے معاملے میں مولانا حالی کا جواب، مگر روانی اور سادگی میں ان سے ہی نہیں، سرسیّد اور ان کے تمام رفقاء سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اس لیے کہ اُن کی زبان میں دورِ سرسیّد کے تقریباً تمام اہلِ قلم کی روش کے برخلاف انگریزی اور دوسرے غیر اُردو الفاظ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بلکہ بعض بعض جگہ وہ ایسی ٹکسالی اُردو لکھتے ہیں کہ اگرچہ اصل میں ہاپوڑ (ضلع میرٹھ) کے رہنے والے ہیں، وہ حقیقی معنوں میں دلّی کے روڑے کہے جاسکتے ہیں''۔ ۸۳

جلیل قدوائی اخذِ نتائج میں احتیاط کے ساتھ ساتھ متوازن روش کو اختیار کرتے ہیں۔ ان کا تنقیدی رویّہ عدم مرعوبیت، بے تعصبی اور مبالغہ آمیزی سے گریز کا حامل ہے۔ انھوں نے جو دلیل پیش کی ہے وہ وزن رکھتی ہے۔ ان کے بقول حالی، سرسیّد اور اُن کے رفقا کی نثر میں جا و بے جا انگریزی کے الفاظ کا استعمال مذکورہ حضراتِ نثار کی تحریروں کی روانی اور سادگی پر حرف کا باعث ہیں۔ جب کہ بابائے اُردو کی نثر میں یہ عیب نہ ہونے کے برابر ہے۔ جلیل قدوائی نے ان خطوط کی نثر کا نحوی تجزیہ بھی کیا ہے چناں چہ بابائے اُردو کی نثر کا نحوی تجزیہ کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں کہ:

''بے شک ان کے ہاں قواعد کے اس مسلّمہ اصول کی مستقل خلاف ورزی نظر آتی ہے کہ فارسی اور غیر فارسی الفاظ کے درمیان فارسی واو عطف نہیں بلکہ ہندی لفظ 'اور' ہونا چاہیے۔ مگر وہ خود صاحبِ قواعد ہیں اور غدر کے بعد کے ہمارے تمام چوٹی کے نثر نویسوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں''۔ ۸۴

جلیل قدوائی کے خیال میں بابائے اُردو کی یہ ایک مسلّمہ اصول کی خلاف ورزی ان کی زبان کے اُصولوں سے ناواقفیت کی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ اُن کا عملی نقطۂ نظر ہے۔ جلیل قدوائی کے بقول:

''نوّے سال سے زائد کی عمر میں یعنی تادمِ مرگ، اُردو کی مستقل و مسلسل خدمت کرنے کے سلسلے میں ہماری زبان میں بابائے اُردو کی حیثیت اس سے کم نہیں جو انگریزی زبان میں شیکسپیئر کی ہے۔ ضرورت ہے کہ شیکسپیئرین گرامر کی طرح اُردو قواعد بھی بابائے اُردو کے قواعد کے تابع ہوکر رہے''۔ ۸۵

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بابائے اُردو عطف کے ایک مسلّمہ قاعدے کے بارے میں شاید کوئی دوسری رائے رکھتے ہوں گے؟ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ''قواعدِ اُردو'' میں عطف کے بارے میں خود بابائے اُردو رقم طراز ہیں کہ: ''ہندی کا 'اور' فارسی کا 'و' دونوں ایک ہی معنوں میں آتے ہیں۔ لیکن استعمال میں یہ فرق ہے کہ 'و' صرف فارسی عربی الفاظ کے ساتھ آتا ہے۔ ہندی الفاظ کے ساتھ اس کا استعمال خلافِ فصاحت خیال کیا جاتا ہے''۔ ۸۶

اُصولی طور پر تو خود بابائے اُردو مذکورہ رائے سے متفق نظر آتے ہیں لیکن ان کی تحریر میں اس اُصول کی جو خلاف ورزی نظر آتی ہے اُس کی جلیلؔ قدوائی نے تاویل کرنے کی کوشش کی ہے جس کی شاید کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ تحریر میں ایسی باریکیوں کا خیال نہیں رہتا۔ لیکن اس سے استناد کرنا اور ایسی صورت میں جب کہ محرّر بھی اس کا قائل ہو، شاید درست نہ ہو۔

اپنے مقدّمے کو جلیلؔ قدوائی نے نہایت انکساری سے ان الفاظ پر ختم کیا ہے:

''بابائے اُردو کی خط نویسی کی ان چند خصوصیات کو جو میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں بیان کی ہیں مُشتے نمونہ از خروارے، سمجھنا چاہیے۔ اُن کی طرزِ انشاء کے دل دادگان کو اس مجموعے کے صفحات میں مختلف انواع کی ان سے بھی بدر جہا زیادہ خوبیاں ملیں گی۔ مجھ سے زیادہ قابل اصحاب کی نظر میں ان خطوط کے بعض ایسے پہلوؤں کا احاطہ کریں گی جن تک میری نظر نہیں پہنچ سکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھ سے اس موضوع پر لکھنے کا پورا پورا حق نہیں ادا ہو سکا اور ہو بھی کیونکر:

داماں نگہ تنگ و گلِ حُسنِ تو بسیار
گلچینِ نگاہِ تو ز داماں گلہ دارد!'' ۸۷

اس اقتباس میں جلیلؔ قدوائی نے اپنی تحریر کو ''ٹوٹی پھوٹی زبان'' قرار دیا ہے حالانکہ ایسی رواں اور سادہ نثر پر جوان کے مخصوص اسلوب کی حامل ہو ایسا لکھنا حد درجہ انکساری ہی کا باعث ہے۔

اس مجموعے کا مقدمہ فی الواقع جلیلؔ قدوائی کی نثر کا بھی ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اور اسی خصوصیّت کے باعث ان کی تنقید میں بھی تخلیق کی شان پائی جاتی ہے۔ یہ بحث الگ ہے کہ تنقید کی زبان ایسی نہ ہونی چاہیے ایسی ہونی چاہیے۔ ایسے اعتراضات تو جلیلؔ قدوائی کے بعد لکھنے والے پروفیسر آلِ احمد سرورؔ پر بھی کیے گئے ہیں۔

اگرچہ اس ضمن میں حالیؔ اور احتشام حسین کی زبان تنقید کے لیے موزوں ترین تسلیم کی جاتی ہے۔ لیکن جلیلؔ قدوائی اپنی تحقیق و تنقید میں موضوع کی مناسبت سے زبان استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن تحقیقی و تنقیدی تحریریں پڑھتے ہوئے قاری کی دل چسپی برقرار رہتی ہے۔ جلیلؔ قدوائی نے بابائے اُردو کی مکتوب نگاری کی خصوصیات پر جس جامع انداز سے روشنی ڈالی ہے اس کے بارے میں معروف محقق و نقاد

جناب مشفق خواجہ نے یقیناً درست فرمایا ہے کہ: ''مولوی عبدالحق کی مکتوب نگاری پر یہ اب تک پہلی اور جامع تحریر ہے''۔۸۸

''اُردوے مصفّا'':

اب مولوی عبدالحق کے خطوط پر مشتمل مذکورہ مجموعے ''اُردوے مصفّا'' کے تحقیقی جائزے کی طرف آتے ہیں۔ یہ جائزہ غلط منسوبات کی تحقیق کے ذیل میں آتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا اور بنیادی نوعیت کا سوال یہ ہے کہ: کیا ''اُردوئے مصفّا'' کے اصل مرتّب جلیل قدوائی ہیں یا ابوتمیم فرید آبادی؟ چناں چہ ذیل میں اس امر کا تحقیقی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

بابائے اُردو کے خطوط کا یہ مجموعہ ''اُردوے مُصفّا'' کے نام سے ۱۹۶۱ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ درحقیقت جلیل قدوائی کا مرتبہ تھا جسے بابائے اُردو کے نود سالہ جشن کے موقع پر شائع کرنے کے لیے جلیل قدوائی نے مرتب کیا تھا۔ مگر عبدالحق جوبلی کمیٹی کے ارکان سے اختلاف کے باعث جلیل قدوائی نے جو اس کمیٹی کے معتمد اعزازی بھی تھے، استعفیٰ دے دیا۔ کمیٹی کے صدر جناب مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی نے اس مجموعے پر اپنے برادر خرد ابوتمیم فرید آبادی کا نام بہ حیثیت مرتّب درج کر کے لاہور سے شائع کر دیا۔ ذیل میں مذکورہ بیان کے سلسلے میں مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی (۱۸۹۰ء۔۱۹۶۴ء) کا ایک مکتوب بنام ڈاکٹر عبدالستار صدیقی پیش کیا جاتا ہے، جس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ''اُردوے مصفّاؔ'' دراصل ''مکتوباتِ عبدالحق'' مرتبہ جلیل قدوائی ہی کا ناتمام نقشِ اوّل تھا۔ مذکورہ مکتوب سیّد ہاشمی فرید آبادی بنام ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ملاحظہ ہو:

''بی۔۱۱۸

ماڈل ٹاؤن (لاہور)

> مخدوم و مکرم۔ مدفیوضہم۔ عنایت نامہ قلمی ۷؍جون کل موصول ہوا۔ خوشی ہوئی کہ کسی طرح ''اُردوے مصفّاؔ'' کا ایک نسخہ آپ تک پہنچ گیا۔ اس کی ترتیب و تحشیہ کا قریباً سارا کام جلیل احمد قدوائی صاحب نے کیا تھا۔ بعد میں خفا ہو گئے اور 'کمیٹی' والوں نے اسے میرے ذمّہ ڈالا۔ اصل خطوط قدوائی ہی کے پاس تھے۰۰۰ ازراہِ کرم آپ براہِ راست قدوائی صاحب کو۰۰۰ بہ تاکید تحریر فرمائیں۔ میں بھی یہاں سے کوئی تدبیر کروں گا کیوں کہ اسکول کے بچوں کی طرح ہماری بات چیت بند ہے:
>
> خاکسار
>
> سیّد ہاشمی''۸۹

اسی طرح سیّد ہاشمی کے ایک اور خط سے بھی یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ ''مکتوباتِ عبدالحق'' کا مسوّدہ

اور طباعت کے لیے جو کاپیاں ملاحظہ کے لیے جناب ہاشمی فرید آبادی کے حوالے کی گئیں تھیں بعد میں اختلافات کے باعث وہ چیزیں جلیلؔ قدوائی واپس نہ لے سکے۔ چناں چہ سیّد ہاشمی، جلیل قدوائی کو رسید دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''مکتوباتِ عبدالحق کا باقی ماندہ مسودہ اور کاپیاں جو پیر کو آپ میرے مکان پر دے گئے تھے موصول ہوئیں''۔۹۰

شجاع احمد زیبا بھی ''اُردوے مصفّا'' کی بابت یہی لکھتے ہیں کہ:

''مولوی عبدالحق صاحب کے خطوط کا مجموعہ جو ہاشمی صاحب کے بھائی ابوتمیم ہاشمی صاحب نے ''اُردو مصفّا'' کے نام سے لاہور سے شائع کیا اور جس کا بیشتر کام قدوائی صاحب کا کیا ہوا ہے۔ ہاشمی صاحب کے پاس پہلے ہی موجود تھا''۹۱

اب مذکورہ بیانات کی روشنی میں جلیلؔ قدوائی کے مندرجہ ذیل بیان کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ آیا ان کی تائید ہوتی ہے یا نہیں؟

جلیلؔ قدوائی رقم طراز ہیں کہ:

''اُردوئے مصفّا کی کوئی کاپی مجھے آج تک کسی نے نہیں مہیّا کی حالانکہ میری مرتب کی ہوئی تھی۔ بعد میں ان خطوط میں اور بہت سے خطوط شامل کر کے کتاب کے ابتدائی نام ''مکتوباتِ عبدالحق'' سے وہ سب میں نے ''مکتبۂ اسلوب'' سے شائع کیے''۔۹۲

جناب ہاشمی فرید آبادی اور شجاع احمد زیبا کے مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں جلیلؔ قدوائی کے بیان کی صداقت ثابت ہو جاتی ہے کہ ''اُردو مصفّا'' کے اصل مرتّب جلیلؔ قدوائی ہی تھے۔ ''عبدالحق جوبلی کمیٹی'' کے باہمی اختلاف کے باعث ابوتمیم فرید آبادی کو اس کا مرتّب ظاہر کر کے لاہور سے ۱۹۶۱ء میں یہ مجموعہ شائع کیا گیا۔ مذکورہ صورتِ حال کو اگر بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جلیلؔ قدوائی کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوئی ہے۔

''مکاتیبِ عبدالحق'' یا ''مکتوباتِ عبدالحق'':

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ۱۹۶۳ء میں جلیلؔ قدوائی نے ''مکتوباتِ عبدالحق'' کے نام سے مولوی عبدالحق کے خطوط کا سب سے ضخیم مجموعہ مکتبۂ اسلوب سے شائع کیا تھا۔ یقیناً بہت سے لوگوں کو معلوم ہے کہ مکتبۂ اسلوب کے مالک مشفق خواجہ تھے اور آپ ہی نے یہ مجموعہ بھی شائع کیا تھا۔

لیکن کچھ عرصے بعد یہی مجموعہ ایک اور ناشر کے نشان پتے اور نام کی جزوی تبدیلی کے ساتھ بازار میں نظر آیا۔ اب ذیل میں دونوں نسخوں کے اشاعتی کوائف ملاحظہ ہوں:

کتاب کا نام: ''مکاتیبِ عبدالحق''	کتاب کا نام: ''مکتوباتِ عبدالحق''
مرتب: جلیل قدوائی	مرتب: جلیل قدوائی
ناشر: اُردو اکیڈمی سندھ	ناشر: مکتبۂ اسلوب
انجمن پریس کراچی	انجمن پریس کراچی
مطبع: انجمن پریس، کراچی	مطبع: انجمن پریس، کراچی
مطبع: سالِ اشاعت	مطبع: سالِ اشاعت
۱۹۶۳ء	۱۹۶۳ء

ان دونوں مجموعوں کے ناموں اور ناشرین کے مختلف ہونے پر تو کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے لیکن سالِ اشاعت اور مطبع کے یکساں ہونے پر اگر تعجب کا اظہار کیا جائے تو یہ ایسا غلط بھی نہ ہوگا۔ ڈاکٹر معراج نیّر زیدی نے بھی اسی عجیب بات کو محسوس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''یہ خطوط جلیل احمد قدوائی کے مرتب کردہ ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں انجمن پریس سے شائع ہوئے تھے۔ لیکن ان کی اشاعت میں ایک عجیب بات بھی ہے کہ یہ مکتوبات دو مختلف عنوانات اور دو مختلف ناشروں کے زیرِ اہتمام اشاعت پذیر ہوئے۔ صرف نام کا فرق ہے ورنہ متن و ترتیب، تقطیع و تعداد، صفحات، کتابت و طباعت ہر اعتبار سے ایک جیسے ہیں۔ ایک کا نام 'مکتوباتِ عبدالحق' ہے اور دوسرے کا نام 'مکاتیبِ عبدالحق'۔ 'مکتوباتِ عبدالحق' کا ناشر اسلوب، کراچی ہے۔ 'مکاتیبِ عبدالحق' اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی نے شائع کی ہے''۔[۹۳]

ڈاکٹر معراج نیّر کی اُلجھن واقعی تحقیق طلب ہے۔ چناں چہ ذیل میں اس صورتِ حال کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک ''مکتوباتِ عبدالحق'' اور ''مکاتیبِ عبدالحق'' علاحدہ علاحدہ نہیں چھپے بلکہ یہ ایک ہی طباعت ہے۔ کیوں کہ اگر یہ علاحدہ علاحدہ طباعتیں ہوتیں تو ان پر اشاعت کی کیفیت درج ہوتی یا پھر کوئی اور قابلِ ذکر اختلاف نظر آتا لیکن اس پوری کتاب میں صرف مذکورہ دو مقامات کے سوا کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اب جب کہ مشفق خواجہ، جلیل قدوائی اور علاء الدین خالد (اُردو اکیڈمی سندھ) کسی تصدیق یا تردید کے لیے موجود نہیں رہے سوائے قیاس کے کیا کیا جاسکتا ہے؟ یا پھر کوئی ایسا دستاویزی ثبوت موجود ہو جس کی بناء پر حتمی رائے قائم کی جاسکے۔ سرِ دست تو قیاس ہی سے کام لینا ہوگا کہ جب مکتبۂ اسلوب کا روپیا بہت سی کتابوں میں پھنس گیا اور اس کے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو انھوں نے ''مکاتیبِ عبدالحق'' کے اسٹاک کا معاملہ اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی سے کرلیا۔ چناں چہ یہ سارا اسٹاک بھی اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی نے خرید لیا۔ بعد

ازاں مجموعے اور ناشر کے نام نیز بیرونی اور اندرونی ٹائٹل کی تبدیلی کے بعد اب یہ مجموعہ ''مکاتیبِ عبدالحق'' ہو گیا۔

علاوہ ازیں ایک اور پہلو سے بھی غور کر لیا جائے کہ شاید ''مکتوباتِ عبدالحق'' کا دوسرا ایڈیشن ''مکاتیبِ عبدالحق'' کے نام سے نکلا ہو؟ جیسا کہ ڈاکٹر مختار الدین احمد کے خط سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اپنے ایک خط میں جلیلؔ قدوائی سے ''مکتوباتِ عبدالحق'' بھیجنے کی فرمائش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> ''مکتوباتِ عبدالحق کا وہ پُرانا نسخہ بھی بھیج دیجیے۔ آپ نے اس کے نئے ایڈیشن کے بارے میں لکھا تھا کہ نکل گیا ہے، کسی اور نام سے۔ معین الدین عقیل صاحب کا خط آیا ہے کہ ابھی تک بازار میں نہیں آیا ہے، خیر وہ آتا رہے گا، آپ پہلا ایڈیشن بھیج دیجیے۔''۹۴

جلیلؔ قدوائی کے نام اس سے قبل بھی ۳/مارچ ۱۹۹۲ء کے ایک خط میں مختار الدّین احمد نے جلیلؔ قدوائی کو لکھا تھا کہ:

> ''مشفق خواجہ اپنی ساری مطبوعات مجھے بھیجتے رہے ہیں۔ ''مکتوباتِ عبدالحق'' کسی وجہ سے نہ آ سکی۔ انھیں لکھوں گا کہ اُردوئے 'مصفا' بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے 'مکاتیبِ عبدالحق' (شائع کردہ اُردو اکیڈمی سندھ) کی اشاعت کی خوشخبری سنائی ہے، کسی کو کراچی خط لکھ کر منگواؤں گا۔''۹۵

جلیلؔ قدوائی کے حوالے سے ڈاکٹر مختار الدین احمد کے خطوط کے مندرجہ بالا اقتباسات سے تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ ''مکتوباتِ عبدالحق'' کا دوسرا ایڈیشن ''مکاتیبِ عبدالحق'' اُردو اکیڈمی سندھ کراچی سے شائع ہوا۔ مگر اس ضمن میں راقم الحروف کی معروضات پہلے بھی پیش کی جا چکی ہیں اور اب بھی یہی خیال ہے کہ یہ محض کاروباری معاملہ ہوگا جسے نام کی جزوی تبدیلی کے ساتھ انجام دیا گیا۔ اس ضمن کی تمام تفصیلات بھی چوں کہ کاروباری معاہدے کا حصّہ رہی ہوں گی لہٰذا اسے ظاہر نہیں کیا گیا شاید یہی طے ہوا ہوگا مکاتیب عبدالحق کو دوسرے ایڈیشن کے طور پر بازار میں متعارف کرایا جائے۔

جلیلؔ قدوائی کی ادبی خدمات پر مشفق خواجہ نے ایک طویل مضمون ان کے شعری مجموعے ''خاکسترِ پروانہ'' پر لکھا تھا اس میں بھی آپ نے صرف ''مکتوباتِ عبدالحق'' ہی کا ذکر کیا ہے۔ اس کے دوسرے ایڈیشن کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

راقم الحروف کو مشفق خواجہ اور جلیلؔ قدوائی سے بھی متعدد ملاقاتوں کا شرف حاصل رہا ہے اور ''مکتوباتِ عبدالحق'' کے حوالے سے بھی گفتگو رہی ہے لیکن دوسرے ایڈیشن سے متعلق کوئی ذکر ان کی گفتگو میں کبھی نہیں آیا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ ایک ہی سال (۱۹۶۳ء) میں ایک

ایڈیشن کیسے ختم ہوسکتا ہے؟ پھر اگر دوسرا ایڈیشن شائع کرنا ہوتا تو نام تبدیل کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ نیز ''مکتوباتِ عبدالحق'' مارکیٹ سے اتنی جلدی کیسے غائب ہوگیا؟ یہ امور تحقیق طلب ہیں۔

''مکتوباتِ عبدالحق'' پر حواشی:

جلیلؔ قدوائی نے ان خطوط پر حسبِ ضرورت مختصر حواشی بھی تحریر کیے ہیں تاہم شاید خطوط کی بڑی تعداد کے پیشِ نظر اور مجموعے کی ضخامت جو پہلے ہی ۶۷۸ صفحات کو پہنچ چکی تھی، زیادہ تفصیلات فراہم کرنے میں مانع ہوں۔ لیکن اب جو بعض مقامات پر حواشی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بابائے اُردو اور جلیلؔ قدوائی کے دور میں ان خطوط کے مندرجات سے واقفیت رکھنے والے اصحاب کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جس کے پیشِ نظر ان کے متعلق تفصیلات کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ لیکن چوں کہ آج اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد جب کہ سارا منظر نامہ ہی تبدیل ہوگیا ہے، تو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان پر کچھ مزید حواشی تحریر کیے جائیں۔ لیکن اس کے باوجود جلیلؔ قدوائی نے جن مقامات پر حواشی تحریر کیے ہیں وہ نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی ان کا ایجاز و اختصار ہی ہے جو جامعیت کے وصف سے مملو ہے۔ ذیل میں بطور مشتے نمونہ از خروارے، چند حواشی کے مندرجات پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ ''پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی، صدر شعبۂ عربی، الہٰ آباد یونیورسٹی، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے سب سے پہلے پرووائس چانسلر اور اُردو فارسی، عربی کے زبردست محقق۔ (ص۴۳۲)

۲۔ ''ڈاکٹر سر تیج بہادر (سپرو) بیرسٹرایٹ لا الہٰ آباد، مشہور ہندو لیڈر، اُردو کے عاشق زار و سرپرست ان دنوں کُل ہند، انجمن ترقی اُردو کے صدر تھے''۔ (ص۴۳۲)

۳۔ ''عمر یافعی صاحب حیدر آباد میں بابائے اُردو کے مخلص خدمت گزار، عقیدت مند تھے۔ جنھوں نے اپنا پورا کتب خانہ جو بہ شمول نادر و تاریخی مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخوں کے ہزارہا کتابوں پر مشتمل تھا، بابائے موصوف کی نذر کر دیا۔ یہ کتب خانہ اب بابائے اُردو کے کتب خانۂ خاص کا ایک حصہ ہے''۔ (ص۴۵۰)

۴۔ ''محمد مارما ڈیوک پکتھال مرحوم' مشہور انگریز نو مسلم ادیب، خطیب و مترجم کلام پاک، ایڈیٹر اخبار 'بمبئی کرانیکل' و انگریزی سہ ماہی رسالہ 'اسلامک کلچر' حیدر آباد دکن''۔ (ص۴۷۶)

۵۔ [عزیز احمد] ''مشہور ناول نگار و ادبی نقاد، ڈائرکٹر محکمۂ مطبوعات حکومتِ پاکستان، سابق پروفیسر

انگریزی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن، حال معلّم اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز، لندن۔عزیز صاحب ان خوش قسمت اصحاب میں سے ہیں جن کی ادبی وعلمی پرداخت بابائے اُردو نے اپنی اولاد کی طرح کی ہے۔'' (ص ۵۴۷)

۶۔ ''بابائے اُردو کے جگری دوست، ادیب ومحقق مولوی محمد امین زبیری مرحوم کے بھتیجے محمد نعمان صاحب ایڈوکیٹ کراچی رکن عبدالحق جوبلی کمیٹی۔'' (ص ۴۸۴)

۷۔ ''انجمن کی انگریزی اُردو لغت کی تیاری کی صورت یہ تھی کہ سارے ہندوستان میں منتخب اہلِ کمال کو مختلف حروف ترجمہ وایرادِ معانی کے لیے سپرد کردیے گئے تھے۔ان کے مسودے انجمن کو بھیجے جاتے تھے جہاں ان پر بابائے اُردو کی نگرانی میں ایک منتخب کمیٹی نظرثانی کرتی تھی۔علی گڑھ میں چند حروف سجاد حیدر یلدرم مرحوم کے سپرد تھے اور نظرثانی کے کام میں علی گڑھ، اورنگ آباد ہر دو مقامات پر ڈاکٹر عابد حسین صاحب پیش پیش تھے۔'' (ص ۳۔۲۰۲)

حاصلِ مطالعہ:

''مکتوباتِ عبدالحق'' کے تحقیقی جائزے سے جو معلومات حاصل ہوئیں اس کا خلاصہ ذیل میں نکات کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے:

- جلیل قدوائی کا مرتبہ مجموعہ ''مکتوباتِ عبدالحق'' ان کی متنی نقاد کی حیثیت ومرتبے کو بخوبی ثابت کرتا ہے۔
- ۶۸۰ صفحات کے اس ضخیم مجموعۂ خطوط کو مرتّب کرنے میں جلیل قدوائی کو مشفق خواجہ کا تعاون حاصل رہا۔
- مکتوباتِ عبدالحق کو جامعیت اور مقبولیت کا شرف حاصل ہوا۔
- ''مکتوباتِ عبدالحق'' کو ٹائٹل میں جزوی تبدیلی کے بعد اُردو اکیڈمی سندھ کراچی نے ''مکاتیبِ عبدالحق'' کے نام سے بازار میں متعارف کرایا۔
- ''مکاتیبِ عبدالحق'' اور ''مکتوباتِ عبدالحق'' دو علاحدہ اشاعتیں نہیں بلکہ ایک ہی اشاعت ہے۔
- اس کے مقدمے میں بابائے اُردو کی نثر نگاری کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت وسیرت کے تمام اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔یہ مقدمہ بابائے اُردو کی مکتوب نگاری کے حوالے سے اوّلین اور جامع دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔
- ''اُردوے مصفّا''، ''مکتوباتِ عبدالحق'' کا ناتمام نقش اول ہے اور اس کے اصل مرتب ابوتمیم فرید

آبادی نہیں بلکہ جلیلؔ قدوائی ہیں۔

(iii:1) ''انشائے ہاشمی''[۹۶]:

''انشائے ہاشمی'' نامور مؤرخ ومترجم، صاحب طرز ادیب وشاعر جناب سیّد ہاشمی فرید آبادی (۱۸۹۰ء۔۱۹۶۴ء) کے ستاون خطوط کے متن، حواشی اور ایک ضمیمے پر مشتمل ہے۔ جلیلؔ قدوائی نے اس مختصر مگر اہم مجموعے میں درج ذیل تفصیل کے مطابق خطوط مرتّب کیے ہیں۔

- ہاشمی مرحوم کے ستاون خطوط میں سے تیس خطوط کتاب کے مرتّب جناب جلیلؔ قدوائی کے نام ہیں۔
- تئیس خطوط پروفیسر شجاع احمد زیباؔ کے نام ہیں۔
- تین خط جناب مشفق خواجہ کے نام ہیں۔
- ایک خط سیّد بدر عالم مارہروی کے نام ہے جو بابائے اُردو کے قدیم خدمت گزار تھے۔
- ضمیمہ

کتاب کے آغاز میں جلیلؔ قدوائی نے ''گزارش'' کے عنوان سے مختصر دیباچہ تحریر کیا ہے، جس میں انھوں نے مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی (۱۸۹۰ء۔۱۹۶۴ء) کی ادبی خدمات کے اجمالی جائزے کے ساتھ ساتھ اُردو میں خطوط نویسی کا پس منظر بھی بیان کیا ہے۔ اپنے دیباچے میں جلیلؔ قدوائی نے ان خطوط کی ادبی حیثیت کو اُجاگر کرنے کے لیے اُردو خطوط نویسی کا اجمالی جائزہ پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اگرچہ غالبؔ کے بعد سرسیّد اور علی گڑھ اسکول کے دوسرے لکھنے والوں مثلاً حالیؔ، شبلیؔ، نذیر احمد وغیرہم نے ہماری زبان کو اس قابل بنادیا ہے کہ اب وہ ہر قسم کے مطالب ادا کرنے پر قادر ہے، لیکن اس کے باوجود اُردو میں صاحبِ طرز اہلِ قلم کی افراط نہیں ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے سرسری طور پر جن اہم لکھنے والوں کے نام لیے ہیں اُن میں: ''دودو آزاد (محمد حسین، ابوالکلام) اور سجاد (حیدر یلدرم، انصاری) اور ایک ایک میر ناصر علی، حسن نظامی، نصیر حسین خیال، مولانا عبدالماجد دریابادی، مہدی افادی، نیازؔ، پطرس اور قرۃ العین حیدر'' شامل ہیں۔

اس دیباچے میں جلیلؔ قدوائی نے خطوط نویسی کا جو اجمالی جائزہ پیش کیا ہے اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ جلیلؔ قدوائی رقم طراز ہیں کہ:

> ''غالبؔ نے اپنے خطوط میں جس نثر نویسی کی ابتدا کی تھی اس کے بعد اُردو میں زمان سابق کی سی فارسی نما ادق نیز مرصّع ومقفّیٰ کے بجائے سادہ اور رواں نگارش کا گویا دروازہ کھل گیا اور سرسیّد اور علی گڑھ اسکول کے دوسرے لکھنے والوں حالیؔ، شبلیؔ، نذیر احمد نیز اُن کے متبعین کی کوششوں نے ہماری زبان کو اس قابل بنادیا کہ اب وہ زندگی کے کم وبیش ہر موضوع پر آزادانہ لب کشائی کرسکتی ہے۔۔۔

بایں ہمہ یہ کہنا مشکل ہوگا کہ اُردو میں غالبؔ کے سے طرح دار اور بلند درجہ کے صاحب طرز اہلِ قلم کی افراط ہے۔ اس محدود تعداد میں سے یہاں میں اپنی طرزِ تحریر میں ایک البیلی شان رکھنے والے بزرگ سیّد ہاشمی فرید آبادی کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ وہ مؤرخ، مترجم اور شاعر تھے۔ مگر ان موضوعات پر اپنی تحریروں میں اپنی طرزِ انشاء کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے''۔ ۹۸

اس اقتباس سے اُردو مکتوب نگاری کی تاریخ پر جلیلؔ قدوائی کی گہری نظر کا بھی بخوبی علم ہوتا ہے۔ سادہ اور رواں طرزِ نگارش کے سلسلے میں آپ نے جو چند نام گنوائے ہیں اُن میں اضافہ تو یقیناً کیا جاسکتا ہے مگر کسی نام کو چھوڑا نہیں جاسکتا۔ بلاشبہ طرزِ انشاء کی مذکورہ خصوصیات ''مکتوباتِ ہاشمی'' کے اکثر خطوط میں پائی جاتی ہیں۔

آخر میں جلیلؔ قدوائی کے نام جناب مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی کے ایک طویل خط سے مختصر اقتباس بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے، جس سے ہاشمی مرحوم کے طرزِ انشاء کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی بابت جلیلؔ قدوائی کے موقف کی تائید بھی ہوجاتی ہے۔ ہاشمی صاحب کے خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''حلقہ مذاکرات اسلامیہ
بی ۱/۸۔ ماڈل ٹاؤن (لاہور)
۲/فروری ۵۹ء

حبیب مہر گستر، زاد اکرامہم۔ آپ کا یہ خط، خط کا ہم جنس ہے۔ تین دن میز پر سامنے رہا اور چار دفعہ اسے پڑھ کر لطف اندوز ہوا۔ آپ کی عنایت والتفات کا خواہی نخواہی شکر گزار ہوں۔ ... حضرت ابوالکلام کی ابتدائی الہلالی دور کی آتش نگاری میں کچھ کلام نہیں مگر خطیبانہ زور ہر جگہ اور زیادہ دیر تک نہیں چلا کرتا۔ پھر دہکتے انگارے راکھ اور آگ کی لپٹ فقط دھواں رہ جاتی ہے۔ ''غبارِ خاطر'' گیلی لکڑیوں کو دھونک دھونک کر سلگانے کی مثال ہے۔ اور مہر صاحب نے جو خطوط چھاپے وہ اس غبار کی بھی جھڑی ہوئی گرد معلوم ہوتے ہیں۔ اوہو صاحب، خط بہت طول کھینچ گیا۔ میرا کھانا آ گیا۔ آج کی ڈاک کا وقت بھی گزر گیا۔ چلتے چلتے یہ اور سن لیجیے کہ آپ شوق اور محنت سے 'چیز' اچھی تیار کیجیے۔ کون، کب قدر کرے گا؟ اس وہم میں نہ پڑیے۔

خاکسار، سیّد ہاشمی ۹۹''

مندرجہ بالا اقتباس سے جلیلؔ قدوائی کی بات بخوبی ثابت ہوجاتی ہے کہ ہاشمی فرید آبادی کا اندازِ تحریر ''البیلا'' ہے۔

انشائے ہاشمی کے آغاز میں جلیلؔ قدوائی کے علاوہ شجاع احمد زیبا نے بھی ہاشمی صاحب کے حالاتِ

زندگی اجمالاً مگر بڑے جامع انداز میں پیش کیے ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے اپنے نام ہاشمی صاحب کے خطوط پر بڑے مفید حواشی تحریر کیے ہیں۔

ان خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں جلیلؔ قدوائی کے ہاشمی صاحب سے کچھ اختلافات بھی ہوگئے تھے جس کی مختصر کیفیت یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ بابائے اُردو کے چاہنے والوں میں سے کچھ مخلصین نے ''بابائے اُردو کی نود سالگی کا جشن منانے کے سلسلے میں ایک عبدالحق جوبلی کمیٹی قائم کی تھی''۔[۱۰۰] ہاشمی مرحوم متفقہ طور پر اس کمیٹی کے صدر اور جلیلؔ قدوائی معتمد اعزازی بنائے گئے، اس ضمن میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ جشن کے موقع پر دو کتابیں بابائے اُردو کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔ ایک مجموعۂ مقالات 'ارمغان جوبلی' اور دوسری 'مکتوباتِ عبدالحق' لیکن بعض اراکین کے متضاد رویّوں کی بنا پر یہ جشن منعقد نہ ہوسکا۔ دراصل اس کمیٹی میں مخلص اراکین کے ساتھ ساتھ بعض ایسے لوگ بھی رکن بن گئے جنھوں نے محض جلبِ منفعت کی خاطر نہ صرف اس کمیٹی کے مقاصد کو پورا ہونے نہیں دیا بلکہ صدر اور سیکریٹری میں شدید اختلافات پیدا کرنے کا باعث بھی بنے۔ چناں چہ یہ اختلافات اتنے بڑھ گئے کہ جلیلؔ قدوائی نے سیکریٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا، بعد میں یہ کمیٹی بھی قائم نہ رہ سکی۔ جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا کہ اس جوبلی کے بعض معاملات پر (جس کی تفصیل جلیلؔ قدوائی نے علاحدہ مضمون کی صورت میں 'سات رنگ' کراچی میں شائع کی بعد ازاں 'تجزیے اور تجربے' میں بھی یہ مضمون شامل ہے) جلیلؔ قدوائی اور ہاشمی مرحوم کے درمیان اختلافات ہوگئے تھے۔ اس مجموعے کے خطوط سے اس قضیے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک ضمیمے کی صورت میں عبدالحق جوبلی کمیٹی کی سیکریٹری شپ سے جلیلؔ قدوائی کا مذکورہ استعفیٰ بھی شامل کیا گیا ہے جس میں انھوں نے اپنے اقدام کی وضاحت کی ہے۔

ہاشمی مرحوم کے ان خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جلیل قدوائی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی تحقیق و ترتیب میں دل چسپی رکھتے تھے جس کے لیے انھوں نے سیّد ہاشمی فرید آبادی کے توسط سے مولوی محمد شفیع جو اس علمی منصوبے کے نگراں تھے سلسلۂ جنبانی بھی کی تھی۔ جلیلؔ قدوائی نے محکمۂ اطلاعات سے اپنی خدمات پنجاب یونیورسٹی کے اس پروجیکٹ کے لیے منتقل کرانے کی پوری کوشش بھی کی مگر تنخواہ اور پینشن کے معاملات آڑے آگئے۔ مجبوراً آپ اس علمی اور تحقیقی منصوبے میں شرکت سے محروم رہے۔

حاصلِ مطالعہ:

○ ''انشائے ہاشمی'' اگرچہ ایک مختصر مجموعۂ خطوط ہے مگر اس کے ذریعے ہمیں بعض اہم ادبی، علمی، تحقیقی

اور تاریخی نوعیت کی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

- جلیلؔ قدوائی نے یہ مجموعہ مرتب کر کے اُردو کے ''انشائی ادب'' میں اضافہ کیا ہے۔
- جلیلؔ قدوائی کی ''متنی تنقید'' یا تدوینِ متن کے حوالے سے ''انشائے ہاشمی'' ایک نمایاں ادبی خدمت کی حیثیت رکھتی ہے۔
- سیّد ہاشمی فرید آبادی کے ان خطوط پر جلیلؔ قدوائی اور شجاع احمد زیبا کے حواشی بھی نہایت اہمیّت کے حامل ہیں۔ ان خطوط اور حواشی سے جہاں مولوی عبدالحق اور سیّد ہاشمی فرید آبادی کے سوانح پر روشنی پڑتی ہے۔ وہیں بعض دیگر علمی، ادبی، تاریخی اور تہذیبی موضوعات کے ساتھ ساتھ خود جلیلؔ قدوائی اور شجاع احمد زیبا کے احوال وتعلقات نیز انجمن ترقی اُردو پر کچھ ضروری مسالا فراہم ہوتا ہے۔

ہاشمی صاحب کے ان خطوط سے جلیلؔ قدوائی کے جن بیانات کی تصدیق ہوتی ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱) ''اُردو ے مصفّا'' دراصل جلیلؔ قدوائی کے زیرِ ترتیب ''مکتوباتِ عبدالحق'' کی ناتمام کاوش تھی جو ہاشمی مرحوم کے چھوٹے بھائی سیّد ابوتمیم فرید آبادی کے نام سے لاہور سے شائع ہوئی۔

۲) ''اُردو مصفّا'' میں شامل بابائے اُردو کے خطوط کی جمع آوری، تحشیہ اور ترتیب، وغیرہ کا کام جلیلؔ قدوائی ہی نے انجام دیا ہے۔

۳) انتخاب غالب (نسخۂ قدوائی) کے لیے جو مقدمہ سیّد ہاشمی فرید آبادی نے لکھا تھا وہ جلیلؔ قدوائی کو نہیں دیا گیا۔

(حصّہ دوم:۲) مشمولاتِ متن سے متعلق تحقیق وتنقید:

یوں تو ''متنی تنقید'' یا ''تدوینِ متن، مستقل کتاب کا موضوع ہے لیکن جزوی طور سے مشمولات متن کی تحقیق وتنقید بھی اس دائرۂ کار میں آجاتی ہے۔ مثلاً دیوانِ غالب کے الحاقی عناصر سے متعلق یا جگر مرادآبادی کے ''شعلۂ طور'' سے متعلق مندرجات کی تحقیق وتنقید اس موضوع سے باہر نہ ہوں گے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی کتاب ''متنی تنقید'' میں (طبع اوّل، صفحہ نمبر ۱۰۲ پر) ''اعلیٰ تنقید'' کے عنوان سے جن موضوعات کا ذکر کیا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ متن مستند ہے یا غیر مستند

۲۔ متن کے سنہ تصنیف کا تعین

۳۔ اُن مآخذ کی نشان دہی جو مصنف نے استعمال کیے ہیں

چناں چہ ''اعلیٰ تنقید'' کے ضمن میں اگر جلیلؔ قدوائی کی کاوشوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ نے بھی مشمولاتِ متن سے متعلق چند اہم اور تاریخی نوعیت کے تحقیقی وتنقیدی مضامین سپردِ قلم کیے ہیں۔ ذیل میں جلیلؔ قدوائی کے چند ایسے ہی مضامین کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے:

(i:۲) ''غالبؔ کا الحاقی کلام، ایک داستان''[۱۰۱]:

جلیلؔ قدوائی کا یہ مضمون ''غالبیات'' کے حوالے سے ''متنی تحقیق'' کے باب میں نہایت اہمیّت کا حامل ہے۔

اوّلاً یہ مضمون سہ ماہی ''اُردو'' کراچی میں شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں ''الحاقی کلامِ غالبؔ کی داستان'' کے عنوان سے جلیلؔ کے تیسرے مجموعۂ مضامین ''شعراُوشعریات'' میں شریک کیا گیا ہے۔

اس مضمون میں جلیلؔ قدوائی نے غالبؔ سے منسوب ایسے غیر مستند اور الحاقی کلام کا انکشاف کیا ہے جس کے بارے میں بعض محققین کو پہلے ہی شک تھا لیکن اس مضمون سے یقین ہوگیا کہ آسی لکھنوی کی دریافت کردہ ڈاکٹر عظمت الٰہی کی خاندانی بیاض کی کیا حقیقت ہے۔ جسے علامہ نیاز فتح پوری نے ''نگار'' لکھنؤ میں شائع کیا ہے۔

جلیلؔ قدوائی نے بتایا ہے کہ لکھنؤ، میں وصل بلگرامی کے ہاں آسیؔ لکھنوی کے ایک وقتی شغل نے کس طرح ایک گھمبیر علمی مسئلے کی شکل اختیار کرلی۔ آپ نے تفصیل سے لکھا ہے کہ غالبؔ کے رنگ میں ازراہِ تفنن کہے گئے کلام کو پہلے خود آسیؔ صاحب نے ''کلامِ غالب کا ایک مستقل حصّہ بنادیا''، اور پھر ایک عرصے بعد عرشیؔ رام پوری جیسے محقق اور ماہر غالبؔ نے بھی اسے اپنے مرتبہ دیوان میں شامل کردیا۔

دراصل جلیلؔ قدوائی ایسی نشستوں کے ''محرمِ راز'' رہے ہیں، جن میں آسیؔ لکھنوی، غالبؔ کا مذکورہ ''غیر مطبوعہ کلام'' سنایا کرتے تھے اور لوگ اسے محض ''وقت گزاری اور تفنّنِ طبع کے طور پر ایک لطیفہ'' ہی سمجھتے تھے۔

اُنھوں نے اپنے مضمون کے آغاز میں لکھا ہے کہ ۱۹۲۳ء میں جب وہ علی گڑھ میں ایف اے کے طالب علم تھے، کالج کی چھٹیوں میں اپنے دوست خواجہ مسعود علی ذوقیؔ کے ساتھ لکھنؤ جانا ہوا جہاں وصلؔ بلگرامی (بانی مدیر رسالہ مرقع لکھنؤ) سے اُن کی پہلی ملاقات ہوئی۔ اُن کے بقول:

> ''پہلی ملاقات کے بعد ہی اُن سے بے تکلفی کے تعلقات قائم ہوگئے ... چناں چہ کبھی میں تنہا، کبھی میں اور ذوقیؔ دونوں اُن کے ہاں جانے اور ٹھہرنے لگے پھر ان سے تعلقات اتنے بڑھ گئے کہ ہمارے خانگی معاملات میں دخیل ہونے لگے''۔[۱۰۲]

جلیلؔ قدوائی نے وصلؔ بلگرامی مرحوم سے اپنی ملاقاتوں اور ان کے ہاں منعقد ہونے والی نشستوں کا مفصل حال بھی لکھا ہے۔ جن میں ایک بار اصغرؔ گونڈوی بھی شریک ہوئے تھے کبھی کبھی رام پور سے ہوشؔ بلگرامی بھی آتے تھے۔ جلیلؔ قدوائی نے ریاضؔ خیرآبادی کو بھی وصلؔ بلگرامی کے ہاں مہمان دیکھا تھا۔ عزیزؔ اور صفیؔ بھی مختلف نشستوں میں یہاں آ چکے تھے۔ اثرؔ لکھنوی بھی اگر لکھنؤ میں ہوتے تو ان نشستوں میں شرکت کرتے تھے۔ جب کہ ''صفدرؔ مرزا پوری، اُمیدؔ امیٹھوی، سراجؔ، امین سلونوی، حکیم آشفتہ، آسیؔ وغیرہ شام کے آنے والوں میں تھے''۔[۱۰۳]

ایک بار وصلؔ بلگرامی مرحوم ہی کے ہاں ڈاکٹر عظمت الٰہی سے بھی جلیلؔ قدوائی کی ملاقات ہوئی، انھیں موصوف کی ایک ''خاندانی بیاض کے حوالے سے آسیؔ لکھنوی کی دریافت کے طور پر نیاز فتح پوری نے ''نگار'' میں غالبؔ کا غیر مطبوعہ کلام شائع کیا، بعد میں کچھ اور چیزیں شامل کر کے آسیؔ لکھنوی نے اُسے کلامِ غالب کا ایک مستقل حصہ بنا دیا''۔[۱۰۴] جلیلؔ لکھتے ہیں کہ ان کے بارے میں معلوم ہوا کہ ''طلا فروشی کرتے ہیں''۔[۱۰۵] اسی عبارت کے حاشیے میں ڈاکٹر عظمت الٰہی کے بارے میں جلیلؔ قدوائی نے یہ بھی لکھا ہے کہ: ''طلا یا اسی قبیل کے چکر میں ماخوذ ہوئے۔ سزا پائی اور اسی حالت میں موت واقع ہوئی''۔[۱۰۶]

جلیلؔ قدوائی نے وصلؔ بلگرامی کے ہاں متعدد بار غالبؔ کا مذکورہ قسم کا ''غیر مطبوعہ کلام'' سماعت کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔ چناں چہ اس سلسلے کی پہلی نشست کا احوال بیان کرتے ہوئے آپ رقم طراز ہیں کہ:

> ''ایک بار شام کی نشست میں آسیؔ صاحب کا کلام سننے کے بعد کسی نے اُن سے اچانک کچھ اس قسم کا سوال کیا: 'کہیے آسیؔ صاحب، غالبؔ کا کچھ اور غیر مطبوعہ کلام ہوا؟' میں سمجھا کہ مروجہ دیوان غالبؔ کے بعد جو کلام دست یاب ہوا موصوف اُس پر کچھ کام کر رہے ہوں گے، یا مزید غیر مطبوعہ کلام کی تلاش میں ہوں گے، اس کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے۔ مگر جس آسانی، برجستگی، نیز سنجیدگی اور تبسم کے ملے جلے انداز میں جواب دیا گیا اس نے مجھ پر معاملے کی حقیقت کچھ کچھ واضح کر دی۔ آسیؔ صاحب نے اس طور پر جواب دیا ''جی کیوں نہیں؟ پچھلے دنوں تھوڑا بہت ہوا ہے وہ پیش کرتا ہوں''۔ یہ کہا اور ایک آدھ غزل یا چند اشعار ایسے سنائے جن پر بلاشبہ غالبؔ کے فن کی چھوٹ پڑتی معلوم ہوتی تھی، ۰۰۰ میں شبہ میں پڑ گیا مگر یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ سبھی حاضرین نے اُس کو وقت گزاری اور تفنن طبع کے طور پر ایک لطیفہ سمجھا اور بس''۔[۱۰۷]

اس اقتباس کی عبارت نے اہلِ علم کو خصوصاً ماہرین غالبیات کو چونکا دیا۔ کیوں کہ جلیلؔ قدوائی کے اس بیان نے آسیؔ لکھنوی اور ڈاکٹر عظمت الٰہی کی غیر ثقہ شخصیت ہونے پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔

جلیلؔ قدوائی نے ان نشستوں کا حال اپنے اس مضمون میں تفصیل سے لکھا ہے۔ انھوں نے وصلؔ

بلگرامی اور ڈاکٹر عظمت الٰہی کے قلمی خاکے بھی تیار کیے ہیں جس سے گویا ان کی چلتی پھرتی تصویریں پڑھنے والے کے سامنے آجاتی ہیں۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے جن چند اہم ادبی شخصیتوں کے نام اپنے اس مضمون میں لیے ہیں اُن میں مالک رام، عرشی رام پوری، نادم سیتاپوری اور حامد اللہ افسر بھی شامل ہیں۔ جلیل قدوائی نے تحریر کیا ہے کہ وہ آسی مرحوم کی ''دھاندلیوں'' سے مذکورہ حضرات کو زبانی طور پر نیز اپنے مکتوبات کے ذریعے بھی وقتاً فوقتاً آگاہ کرتے رہے ہیں، اس کا ثبوت مولانا عرشی اور جلیل قدوائی کی مراسلت سے بخوبی ملتا ہے۔ چناں چہ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> ''... مالک رام نے اسکندریہ سے اس کے بارے میں تحریری طور پر دریافت کیا تو میں نے انھیں بے کم و کاست صورتِ حال سے مطلع کر دیا۔ جناب عرشی سے بھی اس مسئلے پر خط و کتابت ہوئی، اگرچہ سوءِ اتفاق سے اُن کے تاریخی نسخے کی اشاعت کے بعد۔ نادم سیتاپوری پاکستان آئے تو اُن سے اس موضوع پر بات چیت ہوئی اور بعد میں انھیں اس واقعے کا حال لکھ کر بھی بھیج دیا۔ آج کل حامد اللہ افسر کراچی میں قیام ہے۔ [افسوس اب مرحوم ہو گئے بلکہ اب تو سبھی مذکور حضرات مرحوم ہو چکے] ان سے اس سلسلے میں گفتگو ہوئی، انھوں نے نہ صرف اس واقعے کی مکمل تائید کی بلکہ ڈاکٹر عظمت الٰہی کے مقدمے اور موت کا قصہ انھیں سے معلوم ہوا''۔ ۱۰۸

مولانا عرشی نے اپنے مرتبہ دیوان کے پہلے ایڈیشن میں ''یادگار نالہ'' کے ذیل میں ایسا کلام بھی شامل کر لیا تھا جو آسی لکھنوی نے غالب کے نام سے شائع کیا تھا۔ اگرچہ مولانا عرشی اس کی طرف سے مطمئن نہ تھے اور انھیں اس کے معتبر ہونے پر شک تھا لیکن جلیل قدوائی کے مکتوب سے انھیں مذکورہ کلام کے جعلی ہونے کا یقین ہو گیا۔ کیوں کہ مذکورہ مکتوب میں جلیل قدوائی نے لکھا تھا کہ: ''میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ وہ غالب کے نہیں ہیں بلکہ خود مرحوم [آسی] کے ہیں''۔ ۱۰۹

جلیل قدوائی کے نام اپنے ایک خط میں مولانا امتیاز علی عرشی نے اپنے مرتبہ دیوان (نسخۂ عرشی) میں آسی کے پیش کردہ غالب سے منسوب کلام کی شمولیت کی وجہ بیان کرتے ہوئے یہ استفسار بھی کیا ہے کہ اتنے اہم واقعے کو انھوں نے اب تک کیوں چھپائے رکھا؟ مکتوبِ عرشی سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''... آسی مرحوم کے متعلق بغیر کسی آپ جیسے محرم راز کے بیان کے بھی میری رائے سدا یہی رہی کہ انھوں نے یہ غزلیں خود لکھیں ہیں... چناں چہ یہ بھی تجویز کچھ دن زیرِ غور رہی کہ 'یادگار نالہ' کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ معتبر اور جعلی۔ آخر میں اس خیال کو اس بناء پر رد کر دیا کہ وادیٔ تحقیق میں 'جعلی' کہنے کے لیے بھی مستند شہادت چاہیے ہے جو بدقسمتی سے مجھے اس وقت میسّر نہ تھی۔ اب ان شاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ایسا ہی کروں گا۔... آپ اتنے دنوں تک اس راز کو چھپائے کیوں

رہے؟ جب اُنھوں [آسی مرحوم] نے یہ غزلیں دیدہ دلیری سے غالبؔ کے نام سے چھاپ دی تھیں تو آپ کو اُردو ادب کی خاطر فوراً اس کی تردید کرنا چاہیے تھی۔ ان کی موت کا انتظار کیوں فرمایا''۔[۱۰]

اس عبارت سے مولانا امتیاز علی عرشی کا خالصتاً محققانہ روّیہ سامنے آتا ہے۔ اقتباس کے مذکورہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جلیلؔ قدوائی کے بیانات کو ''مستند شہادت'' کا درجہ دیتے ہیں اور آیندہ ایڈیشن میں فائدہ اُٹھانے کی نوید بھی دے رہے ہیں۔ فی الواقع مولانا عرشیؔ نے اپنے مرتبہ دیوان کے دوسرے ایڈیشن سے آسیؔ کا پیش کردہ سارا کلام خارج بھی کر دیا لیکن اس سلسلے میں انھوں نے جلیلؔ قدوائی کا حوالہ دینا شاید ضروری نہ سمجھا۔ خیر آمدم برسرِ مطلب، مندرجہ بالا اقتباس کے آخر میں جلیلؔ قدوائی سے اس راز کے سلسلے میں جو استفسار کیا گیا ہے اس کے بارے میں جلیلؔ قدوائی نے اسی مکتوب کے حاشیے میں لکھا ہے کہ:

''... جو اصل سبب تھا موصوف کو لکھ دیا گیا تھا اور وہی کچھ عرصے کے بعد میں نے ... رسالہ اُردو میں شائع شدہ اپنے مضمون 'غالبؔ کا الحاقی کلام: ایک داستان' میں رقم کر دیا''۔[۱۱]

اس اقتباس میں مولانا عرشی کے اعتراضات کا اجمالاً جواب دیتے ہوئے جن تفصیلات کی طرف جلیلؔ قدوائی نے متوجہ کیا ہے، اگر ان پر نظر ڈالتے چلیں تو غیر ضروری نہ ہوگا، کیونکہ ان احوال و واقعات کی تفصیلات پڑھنے والے کے ذہن میں اس سوال کا پیدا ہونا بالکل فطری ہے جیسا مندرجہ بالا مولانا عرشی کے مکتوب کے اقتباس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آخر اتنے عرصے تک جلیلؔ قدوائی نے یہ حقیقت کیوں پوشیدہ رکھی؟ اگر مضمون کے اس پہلو پر جلیلؔ قدوائی نے قلم نہ اُٹھایا ہوتا تو یقیناً یہ مضمون نامکمل رہ جاتا، لیکن انھوں نے خود اپنے بارے میں کیسے کانٹے کے سوال اُٹھائے ہیں، ان کا انداز بھی ملاحظہ کیجیے، اور پھر اس کے اسباب اور وجوہات بھی انھی کی زبانی سنیے، آپ لکھتے ہیں:

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنے دنوں تک ایک ایسے اہم علمی واقعے (حادثے!) کے بارے میں میں نے 'کتمانِ حقیقت' سے کیوں کام لیا اور ادبی دنیا میں دھاندلی ہوتی رہی اور میں اپنے ہونٹوں پر مہر سکوت لگائے کیوں بیٹھا رہا''[۱۲]

جلیلؔ قدوائی نے اس کی وجوہات اور اسباب پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ بارہ تیرہ برس تو وہ بوجوہ ادبی دنیا سے کنارہ کش رہے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد سے ۱۹۶۹ء تک متعدد اہلِ قلم سے برابر اس واقعے کا تذکرہ کرتے رہے ہیں۔ آپ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''مختصراً صورتِ حال یوں ہے کہ بعض نہایت سنگین اسباب اور زندگی کی ناکامیوں بلکہ ناانصافیوں کی وجہ سے میں عرصے تک (غالباً ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۸ء کے دوران) اُردو شعر و ادب سے بیزار رہا، حتیٰ کہ میں نے اُردو کی خدمت سے کم و بیش کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ان ناموافق

حالات نے پاکستان کے قیام کے بعد پلٹا کھایا، چناں چہ جب ہی مجھے ادب کی طرف واپس آنے کی توفیق ہوئی، ۔۔۔لیکن اگر میں نے اب تک [۱۹۶۹ء] یہ واقعہ کسی 'مقالے' کی شکل میں قلم بند نہیں کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے اسے اپنے نہاں خانۂ دل ہی میں مقید رکھا اس دوران میں جس اہلِ قلم سے بات چیت ہوئی میں نے اس سے اس کا تذکرہ کیا''۔۱۱۳

اس حقیقتِ حال کے بعد کم از کم جلیل قدوائی پر ان سوالات کا قرض باقی نہیں رہتا جو اس ضمن میں مولانا امتیاز علی عرشی رام پوری اور دیگر قارئین مضمون کے ذہنوں میں اُٹھ رہے تھے۔ ایک اور بات رہی جاتی ہے وہ یہ کہ جلیل قدوائی نے اس امر پر بھی تعجب کا اظہار کیا ہے کہ اس واقعے سے ان کے علاوہ بھی اُس دور کے متعدد اشخاص آگاہ تھے مگر ''تعجب ہے کہ کسی اور اہلِ قلم نے بھی اس کے بارے میں اس اثنا میں کچھ نہیں لکھا''۔۱۱۴

جلیل قدوائی نے بھی غالب کے الحاقی کلام کو علاحدہ کرنے کی ایک کوشش ناتمام کی ہے۔ کوشش ناتمام اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے اس انتخاب ''کلامِ غالب'' (نسخۂ قدوائی) کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کُلّی طور پر الحاقی کلام سے پاک ہے مگر چوں کہ از روئے اُصولِ تحقیق غیر معتبر یا جعلی کہنے کے لیے بھی مستند شہادت درکار ہوتی ہے، لہٰذا مجبوراً انھیں ایسے کلام سے بھی انتخاب کرنا پڑا ہے جو کلام غالب کی حیثیت سے مشہور ہو چکا ہے لیکن اہلِ نظر کے نزدیک جعلی نہیں تو کم از کم مشکوک ضرور ٹھہرتا ہے۔ لیکن یہ امر قابلِ اطمینان ہے کہ جلیل قدوائی نے ایسے مُشتبہ کلام کو نشان زد کر دیا ہے۔ اس انتخاب کی تفصیل بتاتے ہوئے جلیل قدوائی نے لکھا ہے کہ ۱۹۶۰ء میں بابائے اُردو کی مجوزہ نو دسالہ جوبلی کے موقع پر انھوں نے اپنی طرف سے ''غالب کا نئی ترتیب کے ساتھ ایک انتخاب'' شائع کر کے پیش کیا۔ سیّد ہاشمی فرید آبادی نے انتخاب کا نام ''کلامِ غالب نسخۂ قدوائی تجویز کیا۔ سردست اس انتخاب میں جلیل قدوائی کے اختیار کردہ طریقے کا بیان کیا جاتا ہے جو انھوں نے الحاقی یا غیر مطبوعہ یا غیر معتبر کلام کے ترک کرنے کے سلسلے میں اختیار کیا۔ اس ضمن میں آپ لکھتے ہیں کہ:

''اُصول یہ طے ہوا کہ جو میرا سنا ہوا کلام یاد آئے اسے ترک کر کے باقی کے سلسلے میں آسی اور نیاز کو شبہ کا فائدہ دے کر اس کلام سے بھی انتخاب کر لیا جائے، چناں چہ یہی کیا گیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ سو فی صد معقول طریق کار نہ تھا مگر اس کے سوا چارۂ کار بھی کیا تھا؟''۔۱۱۵

جلیل قدوائی خود اس طریقۂ کار سے مطمئن نہ تھے جس کا اظہار انھوں نے اپنے مذکورہ بیان میں بھی کیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ عرشی رام پوری نے بھی اس طریقے کو غیر تسلی بخش قرار دیا۱۱۶ اگرچہ خود عرشی رام پوری نے اپنے مرتبہ دیوان کے پہلے ایڈیشن میں ایسے تمام 'غیر مطبوعہ کلام کو 'الحاق کے شبہ' کے باوجود شامل

کیا تھا[۱۷]۔ اور اسی کو بنیاد بناتے ہوئے جلیل قدوائی نے آسی کے حوالے سے شامل کردہ مشتبہ کلام بھی نسخۂ عرشی سے منتخب کر لیا، لیکن عرشی رام پوری نے دوسرے ایڈیشن میں اس کی تلافی کرتے ہوئے آسی کا پیش کردہ سارا کلام خارج کر دیا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو جلیل قدوائی کا ''دیوانِ غالب'' (نسخۂ عرشی) کے پہلے ایڈیشن سے استدلال کرنا شاید کچھ مناسب نہ تھا، لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ اہم اور واقعی مشکل تھی کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد وہ ''ایک ایک شعر کے بارے میں یہ حکم لگائیں کہ ''یہ معتبر ہے اور وہ غیر معتبر بالخصوص جب کہ'' ان کے ''سنے ہوئے کلام کے علاوہ اور کلام بھی آسی سے منسوب ہو چکا تھا''۔[۱۸]

مولانا عرشی کے خیال میں جلیل قدوائی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ غالب کے ایسے مشتبہ اور غیر معتبر کلام سے جس کے راوی، اور عینی شاہد خود جلیل قدوائی بھی ہیں، احتراز کرنا چاہیے تھا وگرنہ کچھ مندرجہ ذیل قسم کے اعتراض کا وارد ہونا غیر متوقع نہیں تھا، جیسا کہ مولانا امتیاز عرشی نے انتخاب کے غیر مستند حصے کے بارے میں جلیل قدوائی کو لکھا بھی کہ:

> ''۔۔۔اس انتخاب میں آسی مرحوم کی تصنیفات میں سے کئی غزلوں کے انتخابات آپ نے شامل کر لیے ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے؟ کیا آپ نے اپنے پچھلے خیال سے رجوع فرما لیا ہے اور آپ آسی والی کل یا کچھ غزلوں کو غالب کا مان گئے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو اس کے وجوہ کیا ہیں؟ تفصیل سے مطلع فرمایئے۔ اور اگر صرف سہواً ایسا ہوا ہے تو بتایئے تاکہ میں بھی اپنی رائے میں کوئی تبدیلی کرنے کے بارے میں کچھ نہ سوچوں''۔[۱۹]

اس کے جواب میں بھی جلیل قدوائی نے اپنی اُنھی معروضات کی طرف متوجہ کیا ہے جو پہلے بیان کی جا چکی ہیں۔

حاصلِ مطالعہ:

زیرِ نظر مضمون کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آسی لکھنوی کے حوالے سے جو الحاقی کلامِ غالب متداول نسخوں میں شامل ہو گیا تھا اسے جلیل قدوائی کے بیانات ہی کی بنیاد پر الحاقی قرار دیا گیا۔ چناں چہ امتیاز علی عرشی رام پوری نے جلیل قدوائی کے بیانات سے استدلال کرتے ہوئے اپنے مرتبہ ''دیوانِ غالب'' (نسخۂ عرشی) کے دوسرے ایڈیشن سے ایسا تمام کلام خارج کر دیا۔

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو یہ مضمون نہایت قابلِ قدر ہے۔ خصوصاً ''متنی تنقید و تحقیق'' کے حوالے سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ علم کے لیے تو یہ بہت ہی اہم مضمون ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس مضمون کے متعدد حوالے اور پیرا گراف اپنی کتاب ''ادبی تحقیق کے اُصول'' میں شامل کیے ہیں جن سے طالبانِ تحقیق

آج بھی فائدہ اُٹھا رہے ہیں، اور آیندہ بھی اُٹھاتے رہیں گے۔

(ii:۲) ''جگرِ لخت لخت'' ۱۲۰:

''متنی تنقید'' کا یہ حصہ جگر مراد آبادی سے متعلق جلیل قدوائی کے مطبوعہ سلسلۂ مضامین ''جگرِ لخت لخت'' اور اس کے چند ضمیموں پر مشتمل ہے، جو ۶۳-۱۹۶۲ء میں سہ ماہی ''العلم'' کراچی کی مسلسل آٹھ اشاعتوں (جولائی۔ستمبر ۱۹۶۲ء تا اپریل۔جون ۱۹۶۴ء) میں طبع ہوئے تھے۔ اس سلسلے کا ایک مضمون ''پہلا شعلۂ طور اور ترتیبِ کلام جگر''، ''فاران'' کراچی کے جگر نمبر (اگست۔اکتوبر ۱۹۸۰ء) میں شائع ہوا تھا۔

جلیل قدوائی مرحوم ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جنھوں نے جگر کو نہ صرف دیکھا اور سنا، بلکہ وہ ان کے قریبی حلقۂ احباب میں بھی شامل رہے۔ ان سے آپ کا یہ مخلصانہ ربط وضبط نہ صرف ان کے کلام ہی سے والہانہ لگاؤ کے باعث تھا، بلکہ آپ ان کی شخصی خوبیوں کے بھی گرویدہ تھے۔ آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ جگر کا اوّلین ''شعلۂ طور'' کو آپ ہی نے مرتب کیا تھا لیکن اشاعت کے وقت اس میں اس قدر ردّ وبدل سے کام لیا گیا تھا جس کے باعث خود جگر نے وہ سارا ایڈیشن تلف کرا دیا۔ اس کی تفصیلات آگے بیان ہوں گی۔

جلیل قدوائی، حضرت جگر کے اس زمانے کے جلیس وشیدا تھے جب وہ صرف خواص کے شاعر تھے اور اناؤ میں چوہدری جگت موہن لال رواں کے ہاں مقیم تھے۔ یہیں سے ان کے روابط کا آغاز ہوتا ہے۔ کلامِ جگر سے اس زمانے میں ان کی شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ ان کا زیادہ تر کلام نوک زبان ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ کلام جگر کو اپنی بیاضوں میں بھی محفوظ رکھنے کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ اگر ان کی موجودی میں کبھی جگر اپنا کلام پڑھتے ہوئے بھول جاتے تو یہ فوراً لقمہ دیا کرتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ رسائل وجرائد کے مدیران بھی انھی سے کلامِ جگر کی فرمائش کرنے لگے تھے اور اکثر انھی سے غزلیں حاصل کر کے شائع کرتے تھے۔

جگر کا قیام اُناؤ، حیاتِ جگر کا ایک اہم دورِ سرور تھا اور وہ بھی کس بلا کا! جسے انھوں نے فراموش کر دیا تھا اس کا بیان بھی ان مضامین میں پہلی بار تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔

جگر خوش رقم بھی تھے لہٰذا بسا اوقات وہ بیاضِ جلیل میں جسے اُنھوں نے ''خریطۂ جواہر'' کا نام دے رکھا تھا نہایت خوب صورت نقش ونگار بنانے کے علاوہ اپنے پاکیزہ خط میں غزلیں لکھتے اور مندرجہ غزلوں میں بھولے بسرے اشعار کا اضافہ بھی کیا کرتے تھے۔ جلیل قدوائی نے ایسا تمام کلام ایک ضمیمے کی صورت میں یکجا کر کے طبع کرا دیا تھا۔ علاوہ ازیں قیام اُناؤ کے دوران جگر کی کہی گئی۔ حسبِ ذیل ایسی ۳۲ غزلوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ جو مروّجہ ''شعلۂ طور'' میں نہیں ہیں یا پھر ان کے بہت سے اشعار غائب ہیں۔

مذکورہ بتیس غزلوں کے مطلعوں کے پہلے مصرعے جنھیں جلیل قدوائی نے اپنی بیاضوں سے پیش کیا

ہے، ملاحظہ ہوں:

۱۔ عشق جب مصروف اصلاحاتِ روح وتن میں تھا
۲۔ دلِ حزیں کی تمنا دلِ حزیں میں رہی
۳۔ دہر کی نیرنگیوں کا خوب عرفان ہوگیا
۴۔ آغازِ محبت کا انجام بس اتنا ہے
۵۔ نظر میں ہیچ ہے گلشن تمام دنیا کا
۶۔ آہ یہ عالمِ کثرت تری رعنائی کا
۷۔ سیاہی پردۂ ظلمات کی نقشہ بیاباں کا
۸۔ نشۂ صہبائے غفلت جب ذرا کچھ کم ہوا
۹۔ اپنے ہی جلوے نظر آئے ہر اک تنویر سے
۱۰۔ کبھی جو یار کو مستِ شراب دیکھیں گے
۱۱۔ میری نظروں میں ہے وہ منظرِ زیبائے بہار
۱۲۔ ہر ذرّے کے پیکر میں اک روحِ وفا ڈالی
۱۳۔ جلوے تھے جس قدر چمنِ روزگار کے
۱۴۔ چھوڑا نہ راز کوئی جہانِ خراب کا
۱۵۔ آخر کھلا یہ رازِ طلسمِ مجاز کا
۱۶۔ اے وہ کہ تازہ تجھ سے گلستانِ آرزو
۱۷۔ خود ضیا بار جو اک جلوۂ مستور نہ ہو
۱۸۔ آدمی نشۂ غفلت میں بھلا دیتا ہے
۱۹۔ عشق مضطر ہے مرے دل میں سما جانے کو
۲۰۔ جدھر سے حُسن کا اک گوشۂ نقاب اُٹھا
۲۱۔ درِ فردوس نظر آنے لگا باز مجھے
۲۲۔ نہاں کیے سے کہیں رازِ غم نہاں ہوتا
۲۳۔ بے نقاب آج تو یوں جلوۂ جاناں ہو جائے
۲۴۔ ہو کے فنائے ذاتِ حق دل مرا سوز و ساز میں

۲۵۔ کیسے سجودِ ظاہری کعبۂ امتیاز میں

۲۶۔ ہنسی پھر اُڑنے لگی عشق کے افسانے کی

۲۷۔ ہر پردۂ ہستی میں جب تو متشکّل تھا

۲۸۔ عشق میں مقصودِ اصلی کو مقدّم کیجیے

۲۹۔ سینے سے دل اُچھلتے ہی رفعت نشاں ہوا

۳۰۔ رند وہ ہوں کہ غزل بھی مری رندانہ ہے

(فارسی)

۳۱۔ مست است جگر از مے، مستِ مئے نابِ اولیٰ

۳۲۔ سحرم ندا برآمد ز حجاب ہائے رازے[۱۲۱]

جگر اس معاملے میں بھی یقیناً خوش قسمت تھے کہ انھیں اپنے چاہنے والوں اور قدر دانوں کی کبھی کمی نہ ہوئی، چناں چہ بقول جلیل قدوائی ''جوں جوں وہ بڑھتے گئے اور انھیں نئے نئے قدر داں ملتے گئے وہ اپنے پرانے چاہنے والوں کی طرف سے مطمئن ہوتے گئے''[۱۲۲]۔ زیرِ نظر سلسلے میں جگر کے پرانے چاہنے والوں کا تذکرہ بھی قدرے تفصیل سے ملے گا۔

جلیل قدوائی مزاج شناسِ جگر تھے۔ انھوں نے جگر کو خواص کے حلقوں سے بلند ہو کر عوام میں مقبول ہوتے ہوئے بڑے قریب سے دیکھا ہے، چناں چہ انھوں نے اس میں جگر کی شخصیّت کی جائزہ نگاری کے ساتھ ساتھ جگر کا نفسیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔

کلامِ جگر سے جیسا شغف قدوائی مرحوم کو شروع (۲۵۔۱۹۲۴ء) سے رہا اور انھوں نے جس طرح اس کی حفاظت کا اہتمام کیا اس کا اعتراف خود جگر نے بھی 'شعلۂ طور' جامعہ ملیہ کے پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں کیا ہے۔ افسوس یہ ایڈیشن تلاش بسیار کے باوجود دست یاب نہیں ہو سکا البتہ مذکورہ بیان کی تصدیق جناب مالک رام کی تحریر سے بہ خوبی ہو جاتی ہے، مالک رام لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔ اگر محمود اور جلیل قدوائی نہ ہوتے تو غالباً ان کا کلام کبھی شائع ہی نہیں ہو سکتا تھا اور اگر ہوتا تو کم از کم اس کی یہ ضخامت نہ ہوتی۔ جگر جس طرح لاأُبالی اور بے پروا شخص ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ انھوں نے کبھی باقاعدگی سے اپنا کلام، ایک جگہ جمع نہیں کیا۔ وہ تو خوش قسمتی سے ان دونوں صاحبوں نے شروع سے اس کی حفاظت کا اہتمام کیا، ورنہ خدا معلوم کس قدر ضائع ہو گیا ہوتا، چناں چہ جیسا کہ شعلۂ طور کے دیباچے میں جگر نے اعتراف کیا ہے، انھی دونوں کی بیاضوں سے یہ دیوان مرتب ہوا تھا''۔[۱۲۳]

مندرجہ بالا اقتباس سے اس بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ کلامِ جگر کو محفوظ کرنے میں جلیل قدوائی کی کوششوں کو کتنا دخل رہا ہے۔ اقتباس کے آخری جملے کی وضاحت کرتے چلیں کہ یہ بیان شعلۂ طور کے بعد کے ایڈیشنوں پر تو صادق آ سکتا ہے مگر اوّلین ایڈیشن کے سلسلے میں نہیں۔ کیوں کہ اوّلین شعلۂ طور کو تنہا جلیل قدوائی ہی نے اپنی بیاضوں سے مرتب کیا تھا اور جگر ہی کے ایک شعر سے اس کا نام ''شعلۂ طور'' تجویز کیا تھا۔

جگر اور کلامِ جگر کے قدر دانوں میں نواب زادہ رشید الظفر خان بھی تھے جو والیِ بھوپال کے حقیقی بھائی اور کمانڈر انچیف افواجِ بھوپال کے صاحب زادے تھے اور غرض تعلیم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مقیم تھے۔ ان کے ہاں شعر و سخن کی نشستیں باقاعدگی سے منعقد ہوتی تھیں جن میں اکثر جگر اور ان کے قریبی احباب بھی شریک ہوا کرتے تھے۔

کلامِ جگر سے جلیل قدوائی کے والہانہ شغف کو دیکھتے ہوئے، جو اسی بنا پر جگر کے بوزدیل کہے جانے لگے تھے، نواب زادہ صاحب نے ان سے دیوانِ جگر مرتب کرنے کی فرمائش کی۔ لہٰذا جلیل قدوائی نے تعمیلِ ارشاد کے طور پر اپنی بیاضوں سے جگر کا دیوان مرتب کر دیا۔ اس دیوان کو جلیل نے خود ہی نقل کیا اور جگر ہی کے ایک شعر سے اس کا نام ''شعلۂ طور'' تجویز کیا۔

جلیل قدوائی کے مرتبہ دیوان کو نواب زادہ صاحب اپنے ساتھ بھوپال لے گئے اور وہاں کے سرکاری خطّاط و خوش نویس جناب ہاتف بھوپالی سے اس کی تین نقلیں تیار کرائیں۔ اصل مسوّدہ لوٹاتے ہوئے اس کی ایک نقل جلیل قدوائی کو بھی عنایت کی تھی۔ اس کی دیگر تفصیلات تو اس سلسلۂ مضامین میں دیکھی جا سکتی ہیں، مگر یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ:

- آخر جگر پر کام کرنے والے محققین نے شعلۂ طور کی ترتیبِ اوّل اور اس کی طباعتِ اوّل (۱۹۳۲ء) پر کما حقہٗ توجہ کیوں نہیں دی؟ اور
- نہ انھوں نے اس کے تلف کیے جانے کے حقیقی اسباب ہی کا کھوج لگایا۔

اگر تحقیق کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس سمت میں یہ ضروری کام سرانجام دیا جاتا تو یقیناً جہاں ''شعلۂ طور'' کے اوّلین ایڈیشن کے تلف کیے جانے کے حقیقی اسباب سامنے آتے وہیں اس کے مرتّب کی خدمات بھی پیشِ منظر میں آ سکتی تھیں اور تاریخِ ادب میں ''شعلۂ طور'' کے مرتّبِ اوّل کی تقدیری حیثیت سے جلیل قدوائی کا تذکرہ بھی جگہ پا سکتا۔

حال ہی میں جناب ڈاکٹر احمر رفاعی نے اس تلف شدہ ایڈیشن کی بازیافت کرتے ہوئے اس کی عکسی اشاعت کا اہتمام کیا ہے اور اس کے آغاز میں طباعتِ اوّلین و مابعدہٗ تقابلی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔

بلاشبہ ڈاکٹر صاحب کی یہ علمی خدمت لائقِ تحسین ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے جائزے کے آغاز میں ''شعلۂ طور'' کی اشاعت اوّل اور اس کے تلف کیے جانے کے اسباب کا مختصر بیان بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ اسباب کا ماخذ وہ اطلاعات ہیں جو شریف الحسن عثمانی صاحب نے اپنے مضمون (''مسودۂ شعلۂ طور۔ایک تعارف'' مشمولہ ''ہماری زبان'' علی گڑھ، ۱۵ر مارچ ۱۹۶۹ء) میں بیان کی ہیں نیز اسی مضمون میں پروفیسر آلِ احمد سرور کے حاشیے کی تحریر بھی ان کے پیشِ نظر رہی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ڈاکٹر اعمر رفاعی صاحب کے بیان کا زیادہ تر انحصار اسی حاشیے کی تحریر پر ہے تو غلط نہ ہوگا۔ حالاں کہ اس مضمون کے مندرجات اور اس پر پروفیسر آلِ احمد سرور کی حاشیہ آرائی محلِ نظر ہے۔ اس مضمون کی اطلاعات اور حاشیے کی معلومات کی چھان بین ہونی چاہیے تھی کہ آیا ان کے ذرائع مستند بھی ہیں؟

لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں مذکورہ بیانات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جائے۔ چناں چہ ڈاکٹر اعمر رفاعی صاحب کے پیش کردہ اقتباس از مضمون جناب شریف الحسن عثمانی اور حاشیہ از پروفیسر آلِ احمد سرور کا بالترتیب جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ اوّل جناب شریف الحسن عثمانی کے مضمون کا مذکورہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''جگر مرادآبادی نے وصل بلگرامی کے صلاح و مشورے سے دوسرے مجموعۂ کلام شعلۂ طور کو ترتیب دیا اور وہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ جگر صاحب کو یہ ایڈیشن پسند نہیں آیا لہٰذا تلف کرادیا۔ اس کے بعد نواب سیّد علی حسن خان نے 'شعلۂ طور' کی از سرِ نو ترتیب کا کام شروع کیا اور یہ کام اپنے صاحب زادے نواب شمس الحسن کے سپرد کیا، لہٰذا شمس الحسن اور جگر مرادآبادی نے مل کر جدید 'شعلۂ طور' ترتیب دیا۔ یہ مجموعہ غالباً ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد مختلف ایڈیشن منظرِ عام پر آئے۔ ۱۹۳۲ء والے ایڈیشن کا مسودہ وصل بلگرامی کے پاس رہا جن کے کاغذات میں سے جناب سیّد فضل الرحمان صاحب کو ملا اور ان کے پاس محفوظ ہے۔ یہ مسودہ بہ ظاہر تلف شدہ ایڈیشن کا ہے، لیکن اس میں جگر صاحب کا اپنے اشعار پر اصلاح و ترمیم و اضافہ، غزلوں پر اشعار کی ترتیب کے نمبر، سب کچھ موجود ہیں۔ مسودے میں کچھ غزلوں پر صاد کا نشان ہے، مگر دوسرے ایڈیشن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے اسی ردیف و قافیہ میں نئے سرے سے غزلیں کہہ کر شامل کی گئیں ہیں، گویا مسودہ داغ جگر، اور 'شعلۂ طور' مستند ایڈیشن کے بیچ کی کڑی ہے۔ پورا مسودہ جگر صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، ہر غزل پر دورِ سوم یا دورِ حاضرہ وغیرہ لکھا ہے، بعض غزلوں کے سامنے، اس کی ایک غزل کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے، لکھا ہے۔ بعض اشعار کے سامنے 'قابلِ غور' لکھا ہے۔ بڑھائے ہوئے اشعار دوسری روشنائی سے لکھے گئے ہیں، کاٹے گئے اشعار پر ایک لائن کھینچی ہے کہیں (x) کا نشان لگا ہے اسی وجہ سے ابھی پڑھنے میں آجاتے ہیں۔ فارسی اشعار اس مسودے میں شامل نہیں ہیں۔ یہ مسودہ لائن دار رجسٹر پر لکھا ہے''۔[۱۲۴]

اس اقتباس کے چند محلِ نظر بیانات ذیل میں نکات وار بیان کیے جاتے ہیں:

- تلف شدہ اوّلین ''شعلۂ طور'' جگر نے وصل بلگرامی کے مشورے سے (خود) ترتیب دیا۔
- جگر کو یہ ایڈیشن پسند نہیں آیا لہٰذا تلف کرا دیا۔
- ۱۹۳۲ء والے ایڈیشن کا مسودہ وصل بلگرامی کے توسط سے سیّد فضل الرحمان کو ملا۔ یہ مسودہ بہ ظاہر تلف شدہ ایڈیشن کا ہے۔
- ''گویا مسودہ داغ جگر، اور شعلۂ طور کے مستند ایڈیشن کے بیچ کی کڑی ہے۔ پورا مسودہ جگر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ہر غزل پر دورِ سوم یا دورِ حاضرہ وغیرہ لکھا ہے۔

اب ذیل میں بالترتیب ان نکات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے۔

☆ تلف شدہ اوّلین 'شعلہ طور' کے بارے میں جو کہا گیا کہ اسے وصل بلگرامی کے مشورے سے خود جگر نے ترتیب دیا تھا، بعید از حقیقت ہے۔ جناب عثمانی کا یہ دعویٰ ثبوت کا محتاج ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ مذکورہ ایڈیشن صاحب زادہ رشید الظفر کی فرمائش پر جلیل قدوائی نے اپنی بیاضوں سے مرتب کیا تھا۔ ثبوت کے طور پر ریکارڈ پر موجود مرتّب اوّل کا بیان زیرِ نظر سلسلۂ مضامین میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔[۵]

☆ مذکورہ ایڈیشن کی تلفی کا جو سبب مضمون نگار نے بیان کیا ہے وہ بھی: ع

اک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

جناب عثمانی کے بیان کے مطابق جب خود جگر نے اپنا مذکورہ دیوان مرتب کیا تھا تو پھر ناپسندی کی وجہ؟ جس کی بناء پر اسے تلف کرا دیا گیا۔ جواب ندارد۔ آخر ناپسندی کی کچھ تو وجوہات رہی ہوں گی۔ اتنے صرفے سے شائع ہونے والے اس مجموعۂ کلام کو جس پر دو سال سے بھی کچھ زائد عرصے کی محنت کی گئی ہو، یوں ذرا سی بات پر نذرِ آتش تو نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ اس مضمون میں مذکورہ ایڈیشن کے تلف کرائے جانے کے اسباب کا جائزہ سرے سے لیا ہی نہیں گیا۔ سوائے اس مندرجہ بالا ٹکڑے ''پسند نہیں آیا'' کے علاوہ کچھ بھی تو نہیں لکھا گیا۔

حالاں کہ جلیل قدوائی اس واقع کو اپنے سلسلۂ مضامین ''جگر لخت لخت'' مطبوعہ العلم کراچی میں ۶۳-۱۹۶۲ء میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے تھے۔ جب کہ جناب عثمانی نے اپنا زیرِ بحث مضمون ۱۹۶۹ء میں شائع کرایا۔

☆ سیّد فضل الرحمٰن کے مملوکہ مسودۂ ''شعلۂ طور'' کے بارے میں جناب عثمانی نے لکھا ہے کہ ''یہ مسودہ

بہ ظاہر تلف شدہ ایڈیشن کا ہے''۔ لیکن ''بہ ظاہر'' مماثلت کے ذیل میں کوئی تفصیل ان کے مضمون سے سامنے نہیں آتی۔ آخر وہ کون سی علامات اس مسودے سے ظاہر ہو رہی ہیں جس کی بناء پر جناب عثمانی اسے ''بہ ظاہر تلف شدہ ایڈیشن'' کا مسودہ قرار دے رہے ہیں۔

☆ مضمون نگار نے جناب سیّد فضل الرحمٰن کے مملوکہ نسخے کو ''داغ جگر اور 'شعلۂ طور' کے (مستند ایڈیشن) کے بیچ کی کڑی'' قرار دیا ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں یہ تلف شدہ اوّلین شعلۂ طور کا مسودہ ہے۔ جب کہ فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔

غالباً جناب عثمانی نے ''شعلۂ طور'' کے جامعہ ملیہ والے ایڈیشن کو مستند ایڈیشن تسلیم کر لیا ہے اسی لیے وہ زیر بحث مسودے کو ''داغ جگر'' اور مستند ایڈیشن کے بیچ کی کڑی قرار دے رہے ہیں، حالاں کہ حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھا جائے کہ آخر مستند ایڈیشن کون سا ہے؟ اس کا جواب یقیناً یہی ہوگا کہ ادارۂ فروغ اُردو لاہور کا وہ ایڈیشن جس کا انتساب نواب بہادر یار جنگ کے نام ہے۔ کیوں کہ یہی مروجہ اور مستند ایڈیشن تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایک حد فاصل قائم کرنے کے بعد اب دوسری سمت کے تعین پر غور کیا جائے۔ اس سلسلے میں ہمیں ان حقائق کو تلاش کرنا ہوگا جس کی بناء پر اس کا تعین ہو سکے۔ داخلی شہادتوں کی مدد سے اس امر کا بآسانی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ مسودہ جناب عثمانی کے دعوے کے مطابق ہے یا نہیں۔

اس ضمن میں مسودے کی تحریر اور اس کے ادوار کی تقسیم خاص طور سے قابل توجہ ہے ذیل میں ان امور کا جائزہ بھی بالترتیب پیش کیا جاتا ہے:

o جناب عثمانی کے مطابق ''پورا مسودہ جگر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے''۔ یہ بات تو مضمون نگار کے دعوے کی نفی کرتی ہے۔ کیوں کہ تلف شدہ اوّلین شعلۂ طور جگر کا مرتبہ اور تحریر کردہ نہیں بلکہ جلیل قدوائی کا مرتبہ اور انھی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا جس کی تین نقلیں جناب ہاتف بھوپالی خطاط و خوش نویس سرکار بھوپال نے نواب زادہ رشید الظفر کے حکم پر تیار کی تھیں۔ ۱۲۶

o اب ادوار کی تقسیم کی طرف آتے ہیں۔ اس ضمن میں جناب عثمانی نے لکھا ہے کہ ''ہر غزل پر دورِ سوم یا دورِ حاضرہ وغیرہ لکھا ہے''۔

یہ بات بھی راقم کے بیان کی مؤید ہے اور مضمون نگار کے دعوے کی نفی میں یہی سب سے قوی اور فیصلہ کن دلیل بن جاتی ہے۔ کیوں کہ تلف شدہ اوّلین شعلۂ طور میں ادوار کی تقسیم سرے سے موجود ہی نہیں ہے تو پھر یہ مسودہ شعلۂ طور میں کہاں سے در آئی؟

اس ضمن میں ڈاکٹر احمد رفاعی صاحب کا بیان بھی ملاحظہ ہو:

''اوّلین ایڈیشن میں غزلوں کو حروفِ تہجی کے اعتبار سے ضرور مرتب کیا گیا تھا لیکن ادوار قائم نہیں کیے گئے تھے''۔[۱۲۷]

اس بیان سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اوّلین ایڈیشن میں ادوار قائم نہیں کیے گئے تھے۔ لہٰذا اب حقیقتِ حال روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے نیز حقایق اور قرائن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سیّد فضل الرحمٰن کا مملوکہ مسودۂ ''شعلۂ طور''، ''داغِ جگر'' اور ''شعلۂ طور'' مستند ایڈیشن کے بیچ کی کڑی نہیں ہے بلکہ یہ مسودہ جامعہ ملیہ ایڈیشن اور فروغِ اُردو لاہور کے مستند ایڈیشن کے بیچ کی کڑی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورہ زیرِ بحث مسودہ تلف شدہ اوّلین ''شعلۂ طور'' کا ہرگز نہیں ہے۔

اوّلین شعلۂ طور کے تلف کیے جانے کے اسباب:

جناب شریف الحسن عثمانی کے مضمون کے آخر میں ممتاز نقاد جناب آلِ احمد سرور نے مندرجہ ذیل حاشیہ چڑھایا، جس سے غلط فہمیوں کو راہ ملی۔ مذکورہ حاشیہ ملاحظہ ہو:

''شعلۂ طور کا وہ ایڈیشن جو مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے شائع ہوا تھا، میرے پاس موجود ہے، انتخاب، جگر کی فرمائش پر اصغر گونڈوی نے کیا تھا، مگر ان کے بیان کے مطابق جگر صاحب کو یہ انتخاب پسند نہ آیا''۔[۱۲۸]

اس بیان سے جو غلط فہمی پیدا ہوئی اور جس کا اعادہ بار بار ہوتا رہا وہ یہ ہے کہ:

- تلف شدہ ''شعلۂ طور'' کا انتخاب حضرت اصغر گونڈوی نے کیا تھا جو جگر کو ناپسند ہوا۔

حالاں کہ حقیقت کچھ اور ہے۔ کیوں کہ اگر اصغر گونڈوی ''شعلۂ طور'' کا انتخاب کرتے تو جلیل قدوائی کو اس کا علم ضرور ہوتا۔

آخر کو جلیل قدوائی ہی نے ''شعلۂ طور'' مرتب کیا تھا، اور وہ اصغر اور جگر ہر دو کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ پھر وہ اسی عرصے میں یعنی ''شعلۂ طور'' کی طباعت ۳۲۔۱۹۳۱ء کے وقت الٰہ آباد میں موجود تھے۔ جہاں جلیل قدوائی، حضرت اصغر کے کبھی کبھار کے ملنے والوں میں نہیں، اکثر و بیشتر بلکہ پابندی سے نیاز حاصل کرنے والوں میں سے تھے۔ اس بات کا ثبوت جلیل قدوائی کے ایک مضمون ''اصغر صاحب اور میں''[۱۲۹] سے بہ خوبی ملتا ہے۔

جلیل قدوائی نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ شہزادہ رشید الظفر کی خواہش پر ''شعلۂ طور'' مرتب کرنے کے بعد وہ ایم۔اے اُردو کرنے کے لیے علی گڑھ سے دو سال کی رخصت لے کر الٰہ آباد چلے گئے تھے اس وقت وہاں اصغر گونڈوی بھی مقیم تھے۔

جب کہ علی گڑھ میں شہزادہ رشید الظفر نے ''شعلۂ طور'' کی طباعت کے لیے جناب حامد سعید بھوپالی کو بہترین کاغذ اور نقد رقم دے کر نگرانِ طباعت مقرر کیا تھا۔

جلیل قدوائی کے بیان کے مطابق ''شعلۂ طور'' کی طباعت کے دوران جناب حامد سعید بھوپالی الٰہ آباد بھی آئے مگر اصغر یا جلیل قدوائی سے ملاقات کیے بغیر واپس چلے گئے اس دوران انھوں نے یہ پیغام بھی بھجوایا کہ شہزادہ رشید الظفر مکمل ''شعلۂ طور'' چھپوانے کے حق میں نہیں ہیں وہ چاہتے ہیں کہ جلیل قدوائی اور اصغر سے انتخاب کرالیا جائے مگر ان دونوں حضرات نے انکار کر دیا۔

۱۹۳۲ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں گرمیوں کی تعطیلات کے باعث جلیل قدوائی علی گڑھ آئے ہوئے تھے حسنِ اتفاق دیکھیے کہ اسی دوران ''شعلۂ طور'' طبع ہو کر سب سے پہلے اُنھی کے ہاتھوں میں پہنچا جسے دیکھ کر وہ بہت مایوس ہوئے کیوں کہ بہت سا عمدہ کلام اس طباعت میں خارج کر دیا گیا تھا۔ کاغذ بھی وہ نہیں تھا جس کی اُنھیں اُمید تھی۔ چناں چہ جلیل قدوائی نے تمام صورتِ حال بھوپال لکھ بھیجی۔ جگر بھی وہیں موجود تھے۔ انھیں صورتِ حال کا علم ہوا تو بہت بگڑے نواب زادہ صاحب کے ایما پر جلیل قدوائی ہی نے اس تمام اسٹاک کو بکسوں میں بند کرا کے بھوپال روانہ کیا جہاں وہ تلف کرا دیا گیا۔ چند نسخے علی گڑھ میں جلیل قدوائی کے ہاتھوں ہی تقسیم ہو چکے تھے۔ جسے واپس نہ لیا جا سکا۔[۱۳۰]

سوال یہ ہے کہ اصغر گونڈوی نے ''شعلۂ طور'' کا کیسا انتخاب کیا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی حتیٰ کہ الٰہ آباد میں اس وقت مقیم ''شعلۂ طور'' کے مرتب جلیل قدوائی کو بھی جو کہ جگر کے بوزویل کہے جاتے تھے، خبر نہ ہوئی مگر ایک عرصے بعد اصغر، جگر اور جلیل قدوائی کی عدم موجودی میں آلِ احمد سرور یہ انکشاف کرتے ہیں کہ مذکورہ انتخاب اصغر نے کیا تھا۔ اور اسی انکشاف کو بعد کے ہر مضمون نگار نے بلا تحقیق آگے بڑھایا ہے۔

دراصل واقعہ یہ ہے کہ اس انتخاب کے ذمہ دار حضرت اصغر ہرگز نہیں بلکہ اس کے ذمہ دار ''شعلۂ طور'' کی اشاعت کے نگراں جناب حامد سعید خاں بھوپالی تھے۔ چناں چہ ''شعلۂ طور'' کے مذکورہ انتخاب کو دیکھ کر جگر سخت برہم ہوئے تھے۔ قرینہ بتاتا ہے کہ انھیں یہی کہتے بنی ہوگی کہ یہ انتخاب تو آپ کے پیر و مرشد حضرت اصغر نے کیا ہے۔

اہلِ نظر اور واقفانِ حال اصغر اور جگر کے تعلقات کی نوعیت سے خوب واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ حضرت اصغر، جن کی جناب میں جگر نظر تک اُٹھانے کو سوءِ ادب خیال کرتے تھے چہ جائیکہ وہ اس انتخاب کے بارے میں استفسار کرتے؟ ان سے ایسی توقع ہی بے جا ہے۔

پھر یہ بھی یاد رہے کہ پروفیسر آلِ احمد سرور جنھوں نے ۱۹۶۹ء میں مذکورہ انتخاب کا انکشاف کیا،

علی گڑھ کے شعبۂ اُردو میں ۱۹۳۶ء میں اس وقت آئے تھے۔ جب جلیلؔ قدوائی شعبۂ اُردو سے دست کش ہوکر حکومت ہند کے محکمۂ اطلاعات سے منسلک ہوگئے تھے اور بوجوہ ایک طویل عرصے تک ادبی دنیا سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔ اِدھر حضرت اصغرؔ گونڈوی کا بھی ۱۹۳۶ء میں الٰہ آباد میں انتقال ہوگیا تھا۔ یوں اس واقعے کے اہم شاہدوں کے منظرادب سے ہٹ جانے کے بعد اس ضمن میں قیاس آرائیوں کے امکانات کا پیدا ہونا غیر ممکن نہیں لیکن ایسی قیاس آرائیاں اس وقت دم توڑ گئیں جب ۶۳۔۱۹۶۲ء میں جلیلؔ قدوائی ان تمام حقائق کو ریکارڈ پر لے آئے جس سے صورتِ حال بالکل واضح ہوگئی۔

جلیلؔ قدوائی کے بیانات نہ صرف چشم دید گواہ کے ہیں بلکہ وہ شریک واقعہ بھی ہیں۔ جب کہ جناب پروفیسر آلِ احمد سرور کا بیان ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ پروفیسر آلِ احمد سرور کے بیان کے راوی بقول سرورؔ خود جگرؔ ہیں تو اس کا تحریری حوالہ کم از کم راقم کے علم میں نہیں ہے، چوں کہ جگرؔ خود ''شعلۂ طور'' کی اشاعت کے عرصے میں بھوپال میں مقیم تھے لہٰذا انھیں جیسا حامد سعید خان بھوپالی نے بتایا ہوگا، انھوں نے یقین کرلیا ہوگا۔ لیکن کیا اس کا اظہار جگرؔ نے کبھی تحریراً بھی کیا ہے، اگر ایسا ہوتا تو آلِ احمد سرور کے بیان (مطبوعہ ۱۹۶۹ء بحوالہ ہماری زبان) سے پہلے بھی یقیناً جگرؔ کا یہ بیان کہیں نہ کہیں نقل ہوا ہوتا۔ کم از کم راقم کے مطالعے میں ایسی کوئی تحریر نہیں آئی ہے، اگر فی الواقع ایسی کوئی تحریر ہو تو اس کا از سرِ نو جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ چناں چہ ۱۹۶۹ء کے بعد اصغرؔ سے منسوب انتخاب کی روایت سبھی نقل کرتے آئے ہیں۔ بہت سوں نے حوالے کے ساتھ اس روایت کو دہرایا ہے اور بعض اہلِ قلم حضرات نے تو حوالہ دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

اس بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ تلف شدہ ''شعلۂ طور'' کے ایڈیشن کے انتخاب کو حضرت اصغرؔ سے منسوب کرنا قطعی غلط اور بڑی زیادتی کی بات ہوگی۔ اس واقعے میں حامد سعید خان بھوپالی کے کردار کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو اس اشاعت و انتخاب کے براہِ راست ذمہ دار تھے۔

اوّلین ''شعلۂ طور'' کے انتخاب اور اس کے تلف کیے جانے کے قضیے کے علاوہ بھی ''جگر لخت لخت'' کے سلسلۂ مضامین میں حیاتِ جگرؔ سے متعلق بعض اہم امور زیرِ بحث آئے ہیں۔ مثلاً چند ایک کا بیان ذیل میں کیا جاتا ہے:

- جگرؔ کا قیامِ اُناؤ اور جگت موہن لال رواںؔ سے ان کے تعلقات کا مفصل بیان۔
- جگرؔ اور جلیلؔ قدوائی کے روابط کا آغاز اور یادگار صحبتوں کا بیان۔
- قیامِ اُناؤ کے دوران جگرؔ کی کہی گئی بتیس غزلوں کا اشاریہ۔

- جگر کی پہلی شادی اور طلاق کا بیان۔
- جگر کی اصغر سے ارادت اور حضرت مولانا شاہ عبدالغنی منگلوری علیہ الرحمہ سے بیعت ہونا۔
- جگر کی دوسری شادی اور طلاق۔
- جگر کا چشموں کا کاروبار ترک کرانے میں رواں کا کردار۔
- اناؤ ڈسٹرکٹ بورڈ کے ''گزٹ'' میں جگر کی ایڈیٹری اور ان کی نثر نویسی کا حال۔
- جگر کے معاشقوں کا ذکر، خاص کر شیراز کے بارے میں ان کی نظم ''لوحِ ایام'' کے بارے میں اہم وضاحت۔
- جگر کی اس دور کی ایک اہم عادت کا بیان جس کے مطابق وہ اپنے اشعار لوگوں کو بخش دیتے اور پھر واپس بھی لے لیتے تھے اور اس کے لیے بعض اوقات جھگڑنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔
- جگر کے حافظے کی کمزوری کی متعدد مثالیں اور ان کا اس خرابی کو تسلیم کرنا۔
- جگر کے قیام علی گڑھ کے بارے میں تصریح کہ جلیل قدوائی کے ہوتے ہوئے جگر نے کبھی کسی اور کے ہاں قیام نہیں کیا، نیز جگر کی ناز برداریوں کا مفصل حال۔
- جگر کے کلام سے جلیل کا انہماک اور کلامِ جگر کی حفاظت و جمع آوری کے باعث انھیں جگر کا بوزو یگل کہے جانے کا بیان۔
- شملہ کے کل ہند مشاعروں کی جھلک، جگر اور جلیل قدوائی کی ملاقاتوں کی تجدید کا حال۔
- جگر کا شراب سے تائب ہونا اور ان کی پاکیزہ متاہل زندگی کے آغاز اور نیک انجام کا بیان۔
- قیام پاکستان کے بعد مشاعروں میں شرکت کا حال۔
- جگر صاحب کی اُستادی، شاگردی کے سلسلے میں حضراتِ لکھنؤ کے مؤقف کی کا جائزہ۔
- جگر کی وفات کے بعد اُستادی شاگردی کی نئی بحث کا دوبارہ اُٹھنا اور اس کی تردید۔

اس کے علاوہ کلامِ جگر کا ایک معتد بہ حصہ بھی اس کے ضمیمے میں شامل ہے جو عام طور سے مروّجہ شعلۂ طور میں نہیں ہے۔

حاصلِ نقد و نظر:

- ''جگر لخت لخت'' کے تحقیقی مطالعے سے ہمیں علم ہوا کہ جلیل قدوائی نے نہ صرف پہلے پہل کلامِ جگر کا دوسرا مشہور مجموعہ ''شعلۂ طور'' مرتب کیا تھا بلکہ اس کا نام بھی جگر کے ایک شعر سے آپ ہی نے

نکالا تھا۔ لیکن بوجوہ آپ کے مرتبہ ''شعلۂ طور'' کو اصل حالت میں شائع ہونا نصیب نہ ہوا۔ اشاعت کے وقت اس میں اتنے ردّوبدل سے کام لیا گیا کہ تقریباً نصف عمدہ کلام شامل ہونے سے رہ گیا۔ چناں چہ جگر کو مطبوعۂ شعلۂ طور نہ صرف یہ کہ پسند نہ آیا بلکہ انھوں نے اس کے تمام اسٹاک کو تلف بھی کرا دیا۔

- مذکورہ تفصیلات سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ جلیلؔ قدوائی ہی ''شعلۂ طور'' کے مرتّب اوّل تھے۔
- اوّلین ''شعلۂ طور'' کا متن جلیلؔ قدوائی کا مرتبہ ہے، اس کی تسوید بھی آپ ہی کے مرہونِ منت رہی۔
- جلیلؔ کے مسوّدے سے بھوپال کے مشہور خوش نویس ہاتف بھوپالی نے تین نقلیں تیار کی تھیں۔
- ''جگر لخت لخت'' کے جائزے سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ تلف شدہ ''شعلۂ طور'' میں ردوبدل اور انتخاب کی ذمہ داری نگرانِ اشاعت جناب حامد سعید بھوپالی پر عائد ہوتی ہے نہ کہ اس کے ذمہ دار اصغر گونڈوی تھے۔
- ''جگرِ لخت لخت'' کے ضمیمے میں جلیلؔ قدوائی نے ایسا تمام کلام شائع کیا ہے جو شعلۂ طور کے مروّجہ ایڈیشن میں نہیں ہے اور جسے جگر نے فراموش کر دیا تھا۔
- ''جگرِ لخت لخت'' کا سلسلۂ مضامین جگر مرادآبادی کے حوالے سے ایک نہایت اہم ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

تحقیق طلب اُمور:

- اوّلین ''شعلۂ طور'' کے مسودے کی بازیافت اور اشاعت، جس کی مدد ہی سے کلامِ جگر کے ابتدائی متن کا مکمل تجزیاتی مطالعہ ممکن ہے۔ علاوہ ازیں ترتیب و تدوین کے میدان میں جلیلؔ کی اس اوّلین کاوش کے سامنے آنے سے تاریخِ ادب میں جگر اور کلامِ جگر کے حوالے سے تحقیقی خدمات انجام دینے والے اوّلین محققین کے سلسلے میں ایک گم شدہ کڑی بھی دریافت ہو سکے گی۔

(iii:۲) ''اقبالؔ کی بعض نظموں کا ابتدائی متن''[۱۳۱]:

زیرِ نظر مضمون بھی جلیلؔ قدوائی کی ''متنی تنقید'' کے ذیل میں آتا ہے، جس میں آپ نے ''بانگِ درا'' کے مشمولات متن کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔

یہ مضمون اوّلاً ''ہمایوں''، لاہور، مئی ۱۹۵۱ء میں پھر ۱۹۵۲ء میں سہ ماہی اُردو، کراچی میں شائع ہوا۔ بعد ازاں آپ کے پہلے تنقیدی مجموعے ''تنقیدیں اور خاکے'' (طبع اوّل، کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ) میں

شامل کیا گیا۔

علاوہ ازیں رحیم بخش شاہین نے جلیلؔ قدوائی کے اس مضمون کو اپنی کتاب ''اوراقِ گم گشتہ'' (علاوہ اقبال کے بارے میں غیر مدون تحریریں) میں بھی شامل کیا ہے۔

آج اقبالیات کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا بچا ہو جس پر ہمارے محققین کی نظر نہ گئی ہو چناں چہ حیاتِ اقبال کے ہر ہر پہلو کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھا جا چکا ہے اور دیکھا جاتا رہے گا۔ کیوں کہ تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوا کرتی۔ اقبالؔ کے کلام سے شغف رکھنے والوں کی کسی دور میں کمی نہیں رہی بلکہ یہ شغف وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔

جلیلؔ قدوائی کا شمار اقبالؔ کے پرانے چاہنے والوں میں ہوتا ہے جب ''ان سے عشق کرنا فیشن بھی ہو گیا تھا''۔[۱۳۲] اور جلیلؔ ایسے اقبالؔ کے تشنہ کاموں کی بھی کوئی کمی نہ تھی جو اپنے ذوق کی تسکین کے لیے اقبالؔ کا ایک ایک شعر بھی سینت سینت کر رکھتے اور اسے اپنی بیاضوں کی زینت بنا کر کلیجے سے لگائے رکھتے تھے۔

کلامِ اقبال کی والہانہ تلاش و جستجو کی ایک بڑی وجہ اس دور میں یہ بھی تھی کہ ''ان کا کلام مرتب شدہ صورت میں نہ ملتا تھا''۔[۱۳۳]

جلیلؔ قدوائی نے اقبالؔ کو ۱۹۲۰ء میں اس وقت دریافت کیا تھا جب وہ اناؤ کے ہائی اسکول میں آٹھویں درجے میں پڑھا کرتے تھے۔ اقبالؔ کی اس دریافت میں مخزنؔ کی پرانی جلدیں وسیلہ بنی تھیں۔ جن کے مطالعے کا موقع ان کے ایک قریبی عزیز[۱۳۴] کے کتاب خانے نے فراہم کیا تھا۔

چناں چہ جوں جوں ایسا تمام منتشر کلامِ اقبالؔ وہ اپنی بیاض میں نقل کرتے گئے توں توں ان کا ذوق وشوق بڑھتا گیا اور ''کلام سے لطف اندوزی میں بھی ترقی ہوتی گئی۔''[۱۳۵] اس ضمن میں جہاں جہاں سے بھی کلامِ اقبال ملتا گیا وہ ان کی بیاض میں نقل ہوتا رہا۔ ''تا آنکہ نومبر ۱۹۲۴ء میں ''بانگ درا'' کے نام سے اقبالؔ کا کلام[۱۳۶] یکجا شائع ہوا۔ ''اس وقت یہ سلسلہ منقطع کر دیا گیا''۔[۱۳۷]

اقبالؔ نے اپنا بہت سا کلام منسوخ کیا، بہت سا کلام نظرِ ثانی کے بعد تبدیل کیا اور بہت سے مقامات پر معمولی حذف واضافے اور ترامیم سے بھی کام لیا۔ یہ شاعر کا حق ہے کہ وہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہتے ہوئے اپنی تخلیق کو مزید سنوارے اور نکھارے۔

جلیلؔ قدوائی نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ: ''اپنے شہ پاروں پر بار بار نظر ڈالنا اور انھیں بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرنا ایک بڑے فن کار کے لیے قدرتی امر ہے۔''[۱۳۸]

اُردو شاعری میں یہ روایت قدیم سے چلی آتی ہے۔ حاتم کا ''دیوان زادہ'' ہو یا پھر غالبؔ کا

دیوان ان سبھی کے یہاں اپنے کلام پر سختی کے ساتھ نظر ثانی اور حک و اضافے کی مثالیں نظر آتی ہیں۔

اقبال نے بھی اپنی شعری تخلیقات کو خود احتسابی کے ان کٹھن مراحل سے گزارا ہے۔ نتیجتاً آپ کا بہت سا ابتدائی کلام جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکا تھا، بانگِ درا کے انتخاب کے وقت آپ کے ترقی یافتہ مذاق شعری اور کڑے معیار پر پورا نہ اُترنے کے سبب منسوخ ٹھہرا۔ اسی طرح آپ نے زبان و بیان کے حوالے سے بھی ہونے والے اعتراضات پر سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے اسے رد یا قبول کیا ہے۔ چناں چہ آپ کا ایسا کلام بھی اصلاح اور حک و اضافے کے بعد پہلی بار 'بانگِ درا' میں شریک ہوا۔ حیدر آباد دکن میں آپ کی اجازت کے بغیر جو کلیاتِ اقبال شائع ہوا اُسے بھی آپ نے ناپسند کرتے ہوئے تلف کرا دیا۔ مقصد یہی تھا کہ آپ کے مجموعے آپ کے ذوق کے عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کے مقاصد کی بھی نمائندگی کرتے ہوں۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ بانگِ درا کے پہلے ایڈیشن میں شامل (۱۹۲۱ء) کلام سے ماقبل مطبوعہ کلام کا مقابلہ کیا جائے تو فرق واضح ہو جاتا ہے۔

تحقیق اور ترتیب و تدوین کے میدان میں ایسا ابتدائی کلام کا مطالعہ متنی مواقف کے ذیل میں اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ جس سے تخلیق کار یا مصنف کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ نیز متنی محاسن، کے سلسلے میں مصنف کی استعداد، زبان و بیان پر عبور، اور اس کے مخصوص اسلوب کی تشکیل کے سفر پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

ابتدائی کلامِ اقبال کے متن سے دل چسپی رکھنے والوں میں جو اہلِ ذوق اور محققین نمایاں ہیں اُن میں چند یہ ہیں۔ مولوی عبدالرزاق (مرتب) ''کلیاتِ اقبال'' ۱۳۹، محمد انور خاں (مرتب کلامِ اقبال۔ قلمی) ۱۴۰، احمد دین (''اقبال''، مرتبہ مشفق خواجہ) ۱۴۱، سیّد عبدالواحد مفتی و عبداللہ قریشی (باقیاتِ اقبال) ۱۴۲، محمد انور حارث (رختِ سفر) ۱۴۳، غلام رسول مہر (سرودِ رفتہ) ۱۴۴، فقیر وحیدالدین (روزگارِ فقیر جلد دوم) ۱۴۵، جلیل قدوائی (اقبال کی بعض نظموں کا ابتدائی متن) ۱۴۶ اور گیان چند جین (ابتدائی کلامِ اقبال۔ بہ ترتیب مہ و سال)۔ ۱۴۷

الغرض ابتدائی کلامِ اقبال کی اشاعت اور اختلاف نسخ کے سلسلے میں اب تک ہونے والے تحقیقی و تنقیدی کاموں میں جزوی اور کُلی دونوں ہی طرح کے کام شامل ہیں۔ کلامِ اقبال کے ابتدائی متن کے تحقیقی و تنقیدی مطالعے کے سلسلے میں جلیل قدوائی کا زیرِ جائزہ کام جزوی نوعیت کا ہے۔

آپ نے اپنے اس کام کے سلسلے میں کوئی دعویٰ نہیں کیا مگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ مضمون اقبال اور کلامِ اقبال سے ان کے قلبی لگاؤ کا آئینہ دار ہے۔ ''جلیل قدوائی نے مضمون کے آغاز ہی میں ابتدائی

متون کے سلسلے میں اہم مآخذ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

'اُردو کے بعض قدیم رسالوں مثلاً مخزن (مرحوم)، زمانہ، صوفی، تمدن (مرحوم)، وغیرہ نیز مختلف پرانی درسی کتابوں، بعض شائقین ادب کی بیاضوں اور سر عبدالقادر مرحوم کے مرتبہ 'انتخاب مخزن' کے صفحات پر اقبال کی کم از کم 'بانگِ درا' [طبع اوّل، ۱۹۲۴ء] میں شامل نظمیں 'نوشتہ بماند سیہ بر سفیہ' کے مصداق آج بھی اپنے ابتدائی متن کے ساتھ موجود ہیں۔۔۔۔ اقبال کی تقریباً وہ تمام نظمیں جو انھوں نے انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسوں میں پڑھیں بعد میں مختلف کتاب فروشوں نے متعدد ایڈیشنوں میں لاکھوں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں شائع کیں۔ ان کے متن کا بھی 'بانگِ درا' کے متن سے مقابلہ کیا جائے تو بہت سی تبدیلیاں نظر آئیں گی'۔[۱۴۸]

جلیل قدوائی نے متذکرہ رسالوں اور درسی کتابوں سے اقبال کا کلام اپنی ''بیاض'' میں نقل کر کے محفوظ کر لیا تھا۔ چناں چہ اسی بیاض کے مندرجات سے انھوں نے ''بانگِ درا'' (طبع اوّل) کی تیس نظموں کا مقابلہ کر کے اختلاف نسخ کے ساتھ ساتھ ان پر اپنی تنقیدی رائیں بھی پیش کی ہیں۔

اس مضمون کے اہداف میں کلامِ اقبال کے ابتدائی متن کو سامنے لانے کے علاوہ اقبال کے حک و اضافے اور ترمیمات کے متعلق اپنا تنقیدی نقطۂ نظر پیش کرنا بھی ہے۔ اس مضمون کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''موجودہ مضمون اسی بیاض میں نقل کی ہوئی نظموں اور ان کے 'بانگ درا' میں شائع شدہ متن کا مقابلہ کرنے کے بعد لکھا گیا ہے۔ پرانے اور نئے متن کا فرق دکھانے کے ساتھ ساتھ میں نے اس فرق کے متعلق جگہ جگہ اختصار کے ساتھ اپنی آزادرائے ظاہر کرنے کی جسارت بھی کی ہے۔ حوالے کے لیے ناظرین کو 'بانگ درا' کا ۱۹۲۴ء کا ایڈیشن سامنے رکھنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ مضمون نامکمل ہے کیوں کہ میری بیاض میں اقبال کی ساری نظمیں نہیں ہیں۔''[۱۴۹]

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جلیل قدوائی نے اپنے اس مضمون میں ''خالص علمی نقطۂ نظر سے گفتگو'' کی ہے جو ''موضوعی مطالعے'' کے حدود میں ''متنی محاسن''[۱۵۰] سے تعلق رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے موضوعی مطالعے کے ساتھ ساتھ ان نظموں کا معروضی مطالعہ بھی کیا ہے جو مشمولاتِ متن کے ''متنی مواقف'' کے حدود میں آتا ہے۔ ''متنی مواقف'' کے ضمن میں ''اصلاحات''، قلم زد سطور یا منسوخ اشعار پر ''مناسب حدود کے ساتھ بحث جیسے امور''[۱۵۱] بھی آتے ہیں۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، جلیل قدوائی نے اپنی بیاض میں درج اقبال کی تیس نظموں کا مقابلہ بانگ درا کے مذکورہ ایڈیشن سے کیا ہے۔ لیکن بعض نظموں کا مقابلہ نامکمل ہے کیوں کہ بوجوہ وہ نظمیں ان کی بیاض میں مکمل نقل ہونے سے رہ گئیں تھیں۔ مذکورہ تیس نظموں کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

۱)	سوامی رام تیرتھ	۲)	سلیمیٰ
۳)	صقلیہ	۴)	ابر
۵)	چاند	۶)	دُعا
۷)	خضرِ راہ	۸)	ترانۂ ملی
۹)	پرندے کی فریاد	۱۰)	تصویرِ درد
۱۱)	حقیقتِ حسن	۱۲)	دریوزۂ خلافت
۱۳)	اسیری	۱۴)	فلسفۂ غم
۱۵)	نوائے غم	۱۶)	کنارِ راوی
۱۷)	بچہ اور شمع	۱۸)	شیکسپیئر
۱۹)	شبنم اور ستارے	۲۰)	رات اور شاعر
۲۱)	انسان اور بزمِ قدرت	۲۲)	نیا شوالہ
۲۳)	ایک آرزو	۲۴)	بلادِ اسلامیہ
۲)	والدہ مرحومہ	۲۶)	ابر کوہسار
۲۷)	پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ	۲۸)	جگنو
۲۹)	شمع و پروانہ	۳۰)	فاطمہ بنت عبداللہ

آگے بڑھنے سے قبل یہ صراحت بھی کرتے چلیں کہ ڈاکٹر گیان چند نے اپنی کتاب ''ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیبِ مہ و سال'' میں جلیلؔ قدوائی کے اس مضمون سے استفادہ کیا ہے اور متعدد جگہ آپ کے پیش کردہ متن اور اختلافِ نسخ کو انھوں نے مضمون کے حوالے سے شاملِ کتاب کیا ہے۔ چناں چہ ڈاکٹر گیان چند کی مذکورہ کتاب میں جلیلؔ کے حوالے سے جن نظموں کے متون پر بحث کی گئی ہے وہ صفحات نمبر کی صراحت کے ساتھ درج ذیل ہیں:

۲) سلیمیٰ ۔۔۔ ڈاکٹر گیان چند: ''ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیبِ ماہ و سال، ص ۴۴۰۔

۳) صقلیہ ۔۔۔ ایضاً: ص ۴۶۔۴۴۵

۴) ابر ۔۔۔ ایضاً: ص ۴۲۵ اور ص ۴۲۰

۵) چاند ۔۔۔ ایضاً: ص ۴۱۹۔

۹) پرندے کی فریاد ۔۔۔ ایضاً: ص ۹۹۔۳۹۸

جلیلؔ قدوائی نے مندرجہ بالا نظموں کے متون کے مقابلے اور موازنے میں صرف حک و اضافہ اور ترامیم ہی کو ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ ان کے بارے میں اپنی بے لاگ رائیں بھی پیش کی ہیں۔ ذیل میں اقبالؔ کی ایسی چند نظموں کو جلیلؔ کے مذکورہ تحقیقی و تنقیدی عمل کے نمونے کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ جن سے آپ کی بے لاگ رائے، زبان و بیان پر گہری نظر، رموز شاعری سے حد درجہ واقفیت، خوبیوں کو کھلے دل سے سراہنے اور اغلاط کی دوٹوک نشان دہی کرنے کا سنجیدہ رویہ سامنے آتا ہے علاوہ ازیں حک و اضافہ اور ترامیم کے رد و قبول کے بارے میں جلیلؔ نے اپنے تربیت یافتہ ذوقِ شعری سے کام لیتے ہوئے اظہار و ابلاغ کے جس سلیقے سے کام لیا ہے وہ خصوصیات، درج ذیل مثالوں سے کھل کر سامنے آجاتی ہیں:

مثال نمبر۱: ''سوامی رام تیرتھ'' ۱۵۲:

[بانگ درا مطبوعہ نومبر ۱۹۲۴ء کا] ''صفحہ ۱۱۸۔ اس نظم کا آخری مصرعہ آج کل یوں مطبوعہ ہے:

ہوش کا دارو ہے گویا مستی تسنیم عشق

ابتدائی متن میں 'دارو' کو مؤنث لکھا گیا تھا جو صحیح تھا۔ معلوم نہیں ترمیم میں اسے مذکر کیوں بنا دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس نظم سے یہ شعر غائب ہے جو ابتدائی متن میں ٹیپ کا شعر تھا:

کیا کہوں زندوں سے میں اس شاہدِ مستور کی
دار کو سمجھے ہوئے ہیں جو سزا منصور کی''

مثال نمبر۲: ''نوائے غم'' ۱۵۳:

[بانگ درا مطبوعہ نومبر ۱۹۲۴ء کا] صفحہ ۱۳۲۔ تیسرے شعر کے مصرعۂ ثانی ''اور منت کش ہنگامہ نہیں جس کا سکوت''

میں ''منت کش ہنگامہ'' کی جگہ ''شرمندۂ ہنگامہ'' تھا۔ ٹیپ کے شعر کا مصرعۂ ثانی:

چوٹ مضراب کی اس ساز نے کھائی نہ کبھی

پہلے یوں تھا:

چوٹ اس ساز نے مضراب کی کھائی نہ کبھی

اب بہتر ہے۔ ترمیم سے ''کی کھائی'' کا کھردرا پن جاتا رہا، اور مصرعۂ رواں اور سجل ہو گیا۔

دوسرے بند کے پہلے مصرعے:

مگر آتی ہے نسیمِ چمن طور کبھی

میں ''مگر'' کی جگہ ''اگر'' تھا۔ جس کی وجہ سے پہلے بند اور دوسرے بند میں کچھ بے ربطی تھی۔ اب

ربط پیدا ہو گیا اور بہتر ہے۔ اسی طرح اس بند کے تیسرے شعر کے پہلے مصرعے:

نغمۂ یاس کی دھیمی سی صدا اُٹھتی ہے

میں پہلے ''نغمۂ یاس کی'' کے بجائے نغمہ یاس سے'' تھا۔ اب معنوی اور صوتی دونوں اعتبار سے بہتر ہے''۔[۱۵۴]

''نوائے غم'' کے بعض اشعار میں علامہ اقبال کی تبدیلیوں کو جلیل قدوائی نے نہ صرف سراہا ہے بلکہ عیب و ہنر کے تناظر میں اپنی مختصر رائے بھی پیش کرتے چلے گئے ہیں۔

ذیل میں اقبال کی نظم ''بچہ اور شمع'' کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے جس میں جلیل قدوائی نے اقبال کی ترامیم سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی آزاد رائے پیش کی ہے:

مثال نمبر۳: ''بچہ اور شمع''[۱۵۵]:

[''بانگ درا''، مطبوعہ نومبر ۱۹۲۴ء کا] صفحہ ۹۴۔ اس نظم کے پہلے شعر میں ''کیسی حیرانی ہے یہ اے طفلک پروانہ خو''

ابتدائی متن: ع: ''کیسی بیتابی ہے تجھ کو طفلک پروانہ خو'' سے اور کسی حیثیت سے بہتر ہو مگر بچے کے لیے ''بے تابی'' ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ حیرانی ''علم و حکمت کا آخری درجہ ہے ابتدائی نہیں اور بچے میں یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ بچے میں تو ''استعجاب'' بھی نہیں ہوتا اس لیے کہ تعجب بھی علم کے بعد کا درجہ ہے اور بچے کو علم سے کیا واسطہ۔ ہاں اس کی بے تابی قدرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مصرعۂ اولیٰ میں تبدیلی مصرعۂ ثانی: ع

شمع کے شعلوں کو گھڑیوں دیکھتا رہتا ہے تو

کی وجہ سے کی گئی۔ مگر میرے خیال میں تبدیلی مصرعۂ ثانی میں کرنی چاہیے تھی تاکہ شعر بچے کی فطرت کے مطابق ہو جاتا۔ زبان کے اعتبار سے بھی پہلا متن بہتر تھا۔ مروجہ مصرعے میں جھول ہے اور ''یہ'' زوائد میں آتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں ''شمع کے شعلوں'' ہے۔ یہ بھی حقیقتاً غلط ہے اس لیے کہ شمع کا ایک ہی شعلہ ہوتا ہے۔ پہلے ''شعلہ'' ہی کا لفظ تھا جو صحیح تھا۔

تیسرے اور ٹیپ کے شعر کا مصرعۂ ثانی ابتدائی متن میں: ع

یہ کہیں دیکھی ہوئی شے کی مگر پہچان ہے

تھا مگر اب یہ مصرع ''یہ کسی دیکھی ہوئی شے'' سے شروع ہوتا ہے۔ جو بہتر ہے۔

دوسرے بند کے پہلے شعر میں صرف دو الفاظ کی تبدیلی اور اُلٹ پھیر سے شعر کو بہت بہتر اور زیادہ زوردار بنا دیا گیا ہے۔ پہلے شعر یوں تھا:

شمع اک شعلہ ہے تو لیکن سراپا نور ہے
آہ اس محفل میں وہ عریاں ہے تو مستور ہے

اب یوں ہے:

شمع اک شعلہ ہے لیکن تو سراپا نور ہے
آہ اس محفل میں یہ عریاں ہے تو مستور ہے

تیسرے بند کے پہلے شعر کا مصرعۂ ثانی یوں تھا، یوں ہی میری زبان پر ہے اور یوں ہی بہتر بھی ہے

:

دیکھتی ہے آنکھ ہر قطرے میں یاں طوفانِ حُسن

اب یوں ہے جس کے پڑھنے میں زبان کو ٹھوکر لگتی ہے:

آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حُسن ۱۵۶

مثال نمبر۴: ''تصویرِ درد'' ۱۵۷:

جلیلؔ قدوائی نے اس نظم کے بارے میں بتایا ہے کہ:

''ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا''۔ والے بند میں کُل چودہ شعر تھے ''بانگِ درا'' میں صرف سات ملتے ہیں جو سات اشعار نکال دیے گئے ہیں ۱۵۸ ان کا متن بھی جلیلؔ نے حسبِ ذیل صراحت کے ساتھ پیش کیا ہے:

> ''مگر واقعہ یہ ہے کہ ایک آدھ کے سوا ان تمام اشعار میں کوئی خاص بات نہیں بلکہ بعض میں خامیاں بھی ہیں۔ اس کے علاوہ قومیت کے متعلق اقبال کے عقائد بھی بدلتے جا رہے تھے اس لیے ہمیں ان اشعار کے تلف ہو جانے کا کوئی رنج نہیں ہونا چاہیے۔'' ۱۵۹

مثال نمبر۵: ''ابر کوہسار'' ۱۶۰:

اسی سلسلے کی ایک اور نظم: ''ابر کوہسار'' ہے، جسے جلیلؔ قدوائی نے ۱۹۲۴ء سے پہلے کسی وقت اپنی بیاض میں نقل کیا تھا، اگرچہ یہ نظم ''مخزن'' لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۶۱ لیکن یہ امر تحقیق طلب ہے کہ آیا مخزن میں اس نظم کی اشاعت اوّل تھی یا دوم۔ کیوں کہ اس کی صراحت نہیں ملتی۔ جلیلؔ قدوائی نے اپنی بیاض کے حوالے سے اس نظم کے جن مقامات کے بارے میں اختلافِ نسخ کی نشان دہی کی ہے اگر ان کی ''مخزن'' کی اشاعت سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جلیلؔ قدوائی کا ماخذ کوئی اور ابتدائی متن ہے۔ ذیل میں بطور مشتے نمونہ از خروارے بیاضِ جلیلؔ اور ''مخزن'' (نومبر ۱۹۰۱ء) کے متون کے اختلاف کی صورتِ حال کا مختصر

جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

''بیاض''، جلیلؔ قدوائی	''مخزن'' (۱۹۰۱ء)
ہے مجھے دامنِ کُہسار میں سُننے کا مزا	ہے مجھے دامنِ کوہسار میں سُننے کا مزا
نغمۂ دُخترِ دو شیزۂ دہقاں کی صدا	نغمۂ دخترِ دوشیزۂ دہقاں کی صدا
وہ سرِ کوہ سے تھم تھم کے اُترتے آنا	وہ سرِ کوہ سے تھم تھم کے اُترنا اس کا
حشر ڈھاتی ہے یہ آہستہ خرامی کی ادا	حشر ڈھاتی ہے یہ آہستہ خرامی کی ادا
سَر پہ وہ دودھ کی گُلیا کو اُٹھاتے آنا	سر پہ وہ دودھ کی ٹھلیا کو اُٹھاتے آنا
اور وہ رک رک کے سنبھلتے ہوئے گاتے آنا ۱۶۳	اور وہ تھم تھم کے اُترے ہوئے گاتے آنا ۱۶۲

اب اس بند کے اختلاف کو ذیل میں نکات کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے:

☆ جلیلؔ قدوائی نے اپنی بیاض کے حوالے سے اس مقالے میں بتایا ہے کہ مندرجہ بالا بند اس نظم کا تیسرا بند تھا۔ مگر راقم نے مخزن کا مطبوعہ متن جو اوپر پیش کیا ہے وہ ترتیب کے لحاظ سے چھٹے نمبر پر ہے۔ چناں چہ ترتیب کا فرق واضح ہوا۔

☆ دوسرے شعر کا پہلا مصرع ''مخزن'' میں یوں طبع ہوا ہے:

وہ سرِ کوہ سے تھم تھم کے اُترنا اس کا

جب کہ جلیلؔ قدوائی نے اپنی بیاض کے حوالے سے اس مصرعے کو یوں لکھا ہے:

وہ سرِ کوہ سے تھم تھم کے اُترتے آنا

☆ تیسرے شعر کا اختلاف بھی نمایاں ہے:

''مخزن'' کا متن: سر پہ وہ دودھ کی ٹھلیا کو اُٹھاتے آنا
اور وہ تھم تھم کے اُترتے ہوئے گاتے آنا

جب کہ بیاض جلیلؔ کا متن یوں ہے:

سر پہ وہ دودھ کی گُلیا کو اٹھاتے آنا
اور وہ رک رک کے سنبھلتے ہوئے گاتے آنا

چناں چہ اس مقالے سے جہاں ترتیب اور اختلافِ نسخ کا فرق خوب واضح ہو جاتا ہے وہیں اس نظم سے متعلق راقم الحروف کی مندرجہ بالا معروضات کی تائید بھی ہو جاتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پیش کردہ نظم کے موازنے میں اختلافِ نسخ کی صورت میں جلیل کا ماخذ کم از کم ''مخزن'' نہیں ہے۔

لیکن اگر سرسری طور پر دونوں متنوں کا جائزہ لیا جائے اور مخزن کے متن کو سب سے پہلا متن تصور کر لیا جائے تو یقیناً یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ جلیلؔ قدوائی نے غلط لکھ دیا۔ جب کہ ایسا نہیں ہے۔ اب اسی نظم کے ایک اور پہلو کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس میں کئی بند خارج کر دیے گئے ہیں۔

اگر چہ جلیلؔ قدوائی نے اس مقالے میں علامہ اقبال کی بعض ترامیم و تبدیلیوں کو سراہا ہے اور ان کی بابت کھل کر ''بہت اچھا''، ''زوردار'' اور ''رواں'' [۱۶۴] جیسے تحسینی الفاظ استعمال کیے ہیں، لیکن بعض جگہوں پر ترامیم سے وہ اتفاق نہیں کرتے جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جس میں اس نظم کے آخری چار بندوں کے اخراج پر وہ شکوہ سنج نظر آتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''۰۰۰اس سے بھی زیادہ بڑا غضب یہ ہوا کہ اس نظم کے آخری چار بند پورے کے پورے موجودہ متن [بانگِ درا: ۱۹۲۴ء] سے خارج کر دیئے گئے ہیں۔ یہ چاروں بند اقتضائے حال کے لحاظ سے نہایت پسندیدہ اور شاعرانہ حیثیت سے اقبالؔ کے بہترین اشعار میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ خبر نہیں اقبالؔ نے اپنے کلام پر یہ ظلم و ستم کیوں اور کس کے مشورے سے گوارا کیا۔ کیوں کہ یقین نہیں آتا انھوں نے از خود اپنے اور اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ یہ ناانصافی کی ہوگی۔'' [۱۶۵]

ان مثالوں سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ جلیلؔ قدوائی نے کس کھلے ذہن سے ترامیم کو نہ صرف قبول کیا ہے بلکہ ان کی توصیف بھی کی ہے۔ لیکن جہاں وہ دیکھتے ہیں کہ ترامیم بے جان اور شعریت کے خلاف ہیں یا حک و اضافہ بہ لحاظ زبان و بیان نامناسب ہے۔ اپنی بے لاگ رائے دینے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ان مثالوں سے اُن کی قوتِ فیصلہ کے ساتھ ساتھ اپنے ذوقِ شعری پر بھروسا کرنے کی صلاحیت کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

الغرض یہ مضمون جلیلؔ قدوائی کے تحقیقی اور تنقیدی کاموں میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ جس سے ہمیں علامہ اقبالؔ کے اس صحت مند روّیے کا بھی پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے کلام کو اعتراضات کی روشنی میں کس طرح دیکھا کرتے تھے اور جس کی بناء پر حک و اضافہ اور ترامیم بھی کیا کرتے تھے۔ شاید یہی روّیہ کلامِ اقبال کی اقبال مندی کا باعث ہے۔

حاصلِ نقد و نظر:

جلیلؔ قدوائی نے اپنے اس مقالے میں ''متنی مواقف'' اور ''متنی محاسن'' دونوں پہلوؤں پر قلم اُٹھایا ہے۔ اول الذکر کے تحت آپ نے اختلافِ نسخ کو ظاہر کیا ہے جب کہ ثانی الذکر میں فنی اور تاثراتی اندازِ نقد کے تحت اپنی بے لاگ رائیں پیش کی ہیں۔

چوں کہ اقبال اپنے کلام پر نظر ثانی اور ترامیم کرتے رہتے تھے لہٰذا یوں بھی ہوا ہے کہ ایک رسالے میں شائع ہونے والا متن بعد کی اشاعت میں قدرے مختلف نظر آتا ہے۔ جلیل قدوائی نے چوں کہ اپنے ماخذ میں یہ صراحت نہیں کی ہے کہ ان کا پیش کردہ متن کس رسالے سے ہے اور یہ پہلی اشاعت پر مشتمل ہے یا بعد کی اشاعت پر۔ اگرچہ ابتدا میں انھوں نے مجموعی طور پر ان رسائل اور کتابوں کے نام بھی بتائے ہیں۔ لیکن ضرورت تھی کہ ہر متن کی صراحت کی جاتی۔ بہرحال آج اگر اوّلین اور مابعد متن کے تقابلی جائزے میں کچھ فرق دکھائی بھی دیتا ہے تو اس کا ایک سبب تو وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا دوسرا سہو کتابت کی رعایت بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ الغرض اس طرح کے تسامحات سے قطعِ نظر کرتے ہوئے دیکھا جائے تو جلیل قدوائی کا یہ مقالہ نہایت وقیع اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

حصہ سوم: متفرق تحقیقی وتدوینی خدمات: بہ سلسلہ راس مسعود

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ سر راس مسعود کی علمی، ادبی، تہذیبی اور تعلیمی خدمات کو اُجاگر کرنے کے لیے جلیل قدوائی نے کراچی میں علی گڑھ کے کچھ دوستوں کی مدد سے ۱۹۶۳ء میں ایک ''یادگار'' بعنوان ''راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی آف پاکستان'' قائم کی تھی۔ مذکورہ سوسائٹی کے قیام اور خدمات کا تحقیقی جائزہ تو ایک علاحدہ مقالے [۱۶] میں لیا جا چکا ہے۔ سرِ دست راس مسعود کے ذاتی کاغذات کی ترتیب واشاعت اور ان کی شخصیت وخدمات کے حوالے سے آپ کی مذکورہ خدمات کا تحقیقی جائزہ مقصود ہے۔

جلیل قدوائی نے سر راس مسعود کی شخصیت اور کارناموں پر جہاں خود متعدد سوانحی تحقیقی، اور تاثراتی مضامین تحریر کیے، وہیں سر راس مسعود کے قریبی احباب اور اس موضوع سے دل چسپی رکھنے والے دیگر اہلِ قلم سے بھی مضامین لکھوائے۔ چناں چہ راس مسعود کے حوالے سے ایسے تمام سوانحی، تحقیقی اور تاثراتی مضامین انھوں نے مندرجہ ذیل مجموعوں کی صورت میں مرتب وشائع کیے ہیں۔

۱۔ ''مرقعِ مسعود'' (اُردو۔انگریزی)

۲۔ ''خیابانِ مسعود'' (اُردو۔انگریزی)

۳۔ ''شعلۂ مستعجل'' (اُردو۔انگریزی)

۴۔ ''اوراقِ گُل'' (اُردو)

پروفیسر اے بی اے حلیم، سر راس مسعود کی سوانح پر کام کر رہے تھے مگر یہ کام ان کی وفات کے باعث نامکمل رہ گیا۔ جلیل قدوائی نے مندرجہ بالا مجموعوں کی صورت میں ایسا تمام مسالہ اکٹھا کر دیا ہے جن کی

مدد سے مستقبل میں راس مسعود کی مکمل سوانح حیات لکھی جا سکتی ہے۔

راس مسعود کے حوالے سے ان کتابوں کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے انھیں: ''ہماری تہذیبی، علمی اور تعلیمی زندگی کے مرقعے'' ۱۶۷ قرار دیا ہے، ''جنھیں سر راس مسعود کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے''۔ ۱۶۸ چناں چہ راس مسعود کی حیات و خدمات سے متعلق جلیل قدوائی کے کاموں پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب مشفق خواجہ اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''جلیل قدوائی نے سر راس مسعود کی زندگی اور علمی، ادبی اور تعلیمی کاموں کو نئی نسل سے متعارف کرانے کے لیے جو کام کیے ان کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جو راس مسعود کے ذاتی کاغذات کی اشاعت سے تعلق رکھتا ہے۔ سر راس مسعود کے کاغذات میں متعدد اہلِ علم کے خطوط شامل ہیں، یہ خطوط قدوائی صاحب نے اپنے حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع کیے ہیں خصوصاً اقبال، بابائے اُردو، جوش، اور ای ایم فوسٹر سے راس مسعود کی خط و کتابت کی اشاعت بے مثال علمی خدمت ہے''۔ ۱۶۹

جیسا کہ مندرجہ بالا بیانات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ جلیل قدوائی نے راس مسعود کی زندگی اور کارناموں کے حوالے سے مندرجہ ذیل تین مختلف جہتوں میں علمی، ادبی اور تحقیقی و تدوینی خدمات انجام دی ہیں:

(۳:الف): سر راس مسعود کے درج ذیل ذاتی کاغذات کی ترتیب و اشاعت:

(i) خطوط (ii) بیاض (iii) ڈائری

(۳:ب): راس مسعود کی شخصیت اور کارناموں سے متعلق مضامین کے مجموعوں کی ترتیب و اشاعت۔

(۳:ج): سر سیّد احمد خان اور جسٹس سیّد محمود کے حوالے سے ایک مجموعۂ مضامین کی ترتیب و اشاعت۔

اب ذیل میں مندرجہ بالا موضوعات پر جلیل قدوائی کی مرتبہ ''راس مسعود اکادمی'' کی مطبوعات کا جائزہ بالترتیب پیش کیا جاتا ہے:

(۳:الف): خطوط

جلیل قدوائی نے جن مشاہیر سے راس مسعود کی مراسلت کو اپنے حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع کیا ہے اُن کی تفصیل درج ذیل ہے:

راس مسعود کے خطوط مشاہیر کے نام:

۱۔ علامہ اقبال کے نام (انگریزی خطوط سے اُردو ترجمہ) ۱۷۰

۲۔ ''پدما بھوشن''، پروفیسر ہارون خان شروانی کے نام (انگریزی خطوط) ۱۷۱ پندرہ عدد

۳۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے نام ۱۷۲ ایک عدد

۴۔ وقار احمد وحبیب اللہ رشدی کے نام ۱۷۳ ایک عدد

۵۔ جلیلؔ قدوائی کے نام ۱۷۴ (ایک انگریزی متن، بقیہ اُردو ترجمہ) چار عدد

۶۔ خواجہ حسن نظامی کے نام ۱۷۵ ایک عدد

۷۔ مولوی عبدالحق کے نام ۱۷۶ چھ عدد

۸۔ مولوی محمد امین زبیری کے نام ۱۷۷ نو عدد

۹۔ جوشؔ ملیح آبادی کے نام ۱۷۸ چار عدد

۱۰۔ حفیظ جالندھری کے نام ۱۷۹ تین عدد

۱۱۔ عبدالرحمٰن چغتائی کے نام ۱۸۰ بارہ عدد

۱۲۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے نام (انگریزی خط سے اُردو ترجمہ) ۱۸۱ ایک عدد

۱۳۔ مولانا محمد عبدالحامد قادری بدایونی کے نام ۱۸۲ ایک عدد

۱۴۔ مولوی عبدالباری ندوی کے نام (انگریزی خط سے اُردو ترجمہ) ۱۸۳ ایک عدد

۱۵۔ کپتان (بعدۂ فیلڈ مارشل) محمد ایوب خان کے نام (انگریزی خط سے اُردو ترجمہ) ۱۸۴ ایک عدد

۱۶۔ سیّد یوسف بخاری دہلوی کے نام ۱۸۵ دو عدد

۱۷۔ نواب زادہ سعید الظفر خان کے نام (انگریزی خط سے اُردو ترجمہ) ۱۸۶ ایک عدد

۱۸۔ ڈاکٹر سیّد محمود (بار ایٹ لاء) ۱۸۷

مشاہیر کے خطوط راس مسعود کے نام

۱۔ نواب امداد امام اثرؔ ۱۸۸ ایک عدد

۲۔ نواب نصیر حسین خیالؔ ۱۸۹ تین عدد

۳۔ خواجہ حسن نظامی ۱۹۰ ایک عدد

۴۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے انگریزی خطوط سے اُردو ترجمہ ۱۹۱ گیارہ عدد

۵۔ مولوی محمد امین زبیری ۱۹۲ بارہ عدد

۶۔ جوشؔ ملیح آبادی ۱۹۳ چھ عدد

۷۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری ۱۹۴ پانچ عدد

۸۔ عبدالرحمٰن چغتائی ۱۹۵ ایک عدد

۹۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے انگریزی خط سے اُردو ترجمہ ۱۹۶ ایک عدد

۱۰۔ شاہ محمود خان (از کابل افغانستان) ۱۹۷ ایک عدد

۱۱۔ شاہ ولی خان (از پیرس کابل کے شاہی خاندان کے فرد) ۱۹۸ ایک عدد

۱۲۔ وزارتِ دربار (از کابل، افغانستان، فارسی) ۱۹۹ ایک عدد

۱۳۔ مولانا محمد عبدالحامد قادری بدایونی ۲۰۰ دو عدد

۱۴۔ مولوی عبدالباری ندوی ۲۰۱ ایک عدد

۱۵۔ مولانا مناظر حسن گیلانی ۲۰۲ دو عدد

۱۶۔ کپتان (بعدہٗ فیلڈ مارشل) ایوب خان کے انگریزی خط سے اُردو ترجمہ ۲۰۳ ایک عدد

۱۷۔ شیخ عطاء اللہ (مؤلف ''اقبال نامہ'') انگریزی خط سے اُردو ترجمہ ۲۰۴

۱۸۔ A. H. Mackenzi (انگریزی) ۲۰۵ ایک عدد

۱۹۔ Sir, Theodore Morison (انگریزی) ۲۰۶ ایک عدد

۲۰۔ E.M.Forster (انگریزی) ۲۰۷ ایک عدد

۲۱۔ Dr. F. Krenkow (انگریزی) ۲۰۸ ایک عدد

اگر چہ راس مسعود کی مشاہیر سے مراسلت کے سلسلے میں مندرجہ بالا فہرست سے جلیل قدوائی کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے لیکن چوں کہ یہ تمام خطوط بکھرے ہوئے ہیں اور یکجا تدوین کے محتاج بھی۔ لہٰذا ان سے کم از کم ترتیب و تدوین کے حوالے سے جلیل قدوائی کی خدمات کا جائزہ نہیں لیا جاسکتا۔ اس مقصد کے لیے تو آپ کا مرتبہ ایک اہم اور مستقل نوعیت کا مجموعۂ خطوط ''فوسٹر۔ مسعود لیٹرز'' کا جائزہ لینا مفید ہوگا۔ چناں چہ ذیل میں ''فوسٹر۔ مسعود لیٹرز'' کا تحقیقی جائزہ پیش کیا جاتا ہے جس سے جلیل قدوائی کی تدوینی و تحقیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ خود راس مسعود کے خطوط کی اہمیت بھی واضح ہو سکے گی۔

"Forster-Masood Letters" Edited by Jalil Ahmad Kidwai ۲۰۹

خطوط کا یہ مجموعہ جلیل قدوائی کی ایک عمدہ تحقیقی اور تدوینی کاوش ہے جو ای ایم فوسٹر اور سر راس مسعود کی مراسلت پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں فوسٹر کے اڑتالیس (۴۸) جب کہ راس مسعود کے تیرہ (۱۳) خطوط کا متن مع قیمتی حواشی و تعلیقات، مرتب و مدون کیا گیا ہے۔

اس کی ترتیب و اشاعت میں جلیل قدوائی نے تحقیقی و تدوین کے اعلیٰ معیار کو نہ صرف پیشِ نظر رکھا ہے بلکہ عملی طور پر اس کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں جن اہم اُمور کا اہتمام نظر آتا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ فراہمیِ متن
۲۔ قرأتِ متن
۳۔ تسویدِ متن
۴۔ مقدمہ
۵۔ متنی محاسن
۶۔ حواشی وتعلیقات
۷۔ ضمیمے
۸۔ کتابیات

اس مجموعے کا مذکورہ عنوانات کے تحت مطالعہ کرنے سے قبل ضروری ہے کہ "EM Forster A life"، از پی این فربینک، اور زیرِ تجزیہ مجموعے ''فوسٹر۔ مسعود لیٹرز''، کے تناظر میں فوسٹر۔ مسعود تعلقات کا بھی جائزہ لیا جائے جس سے جلیل قدوائی کے اس تدوینی اور تحقیقی کام کی اہمیت کا صحیح معنوں میں ادراک کیا جاسکتا ہے۔ چناں چہ ذیل میں مذکورہ اُمور کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

مشہور انگریز ناول نویس ایڈورڈ مورگن فورسٹر Edward Morgan Forster (۱۹۷۰ء۔۱۸۷۹ء) ایک غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل اور انسان دوست شخصیت کا نام ہے۔ ان کے والد کا نام Edward Morgan Llewelln Forster (1847-80) تھا۔ فوسٹر کا خاندان Northumberland سے نقل مکانی کر کے کئی نسلوں تک آئرلینڈ میں سکونت پذیر رہا۔ فوسٹر نے کیمبرج میں تعلیم پائی اور زندگی کے آخری بیس سال اسی مادرِ علمی کے مہمان خانے میں بسر کیے۔ ان کی تحریروں کے کاپی رائٹ بھی کیمبرج یونیورسٹی کو حاصل ہیں۔ فوسٹر اٹلی میں بھی رہے بعدازاں جرمنی میں اطالوی زبان کے ٹیوٹر بھی رہے۔[۱۰]

جب سرسیّد کے نامور پوتے اور جسٹس سیّد محمود کے صاحب زادے، سر راس مسعود حصولِ تعلیم کے لیے ۱۹۰۶ء میں انگلستان گئے تو وہاں ان کے سرپرست سر تھیوڈر ماریسن نے انھیں اطالوی زبان سکھانے کے لیے فوسٹر کی خدمات حاصل کی تھیں۔ لیکن یہ راس مسعود کی ذہانت، غیر معمولی صلاحیتوں اور ان کی زبردست شخصیت کا اعجاز تھا جس نے محض میٹرک پاس (۱۹۰۴ء) غلام ملک کے ایک "Nigger" لڑکے ہونے کے باوجود حکمراں طبقے کے ایک رکن "(Member of the Rulling Race)[۱۱] اور معتبر انگریز دانشور (Senior English Intellectual)[۱۲] کو یوں مرعوب ومتاثر کیا اور اس پر اپنے مذاق

علمی کی کچھ ایسی دھاک بٹھادی کہ وہ اُستادی کے منصب کو دوستی کے رشتے میں بدلنے پر تیار و آمادہ ہوگیا۔ اس کے بعد ان کی دوستی کا یہ رشتہ اس قدر پائیدار ثابت ہوا کہ نہ صرف مسعود کی مختصر زندگی تک قائم رہا بلکہ فوسٹر کی طویل زندگی (تقریباً اکیانوے سال) کے اختتام تک اس کے دل میں مسعود کی محبت کم نہ ہوئی۔ وہ مسعود کی اولاد سے بھی ہمیشہ شفقت و رافت سے پیش آتا رہا۔ مسعود کی اولاد بھی اسے پیار سے ''فوسچا''[۲۱۳] (Forscha جو ''فوسٹر اور چچا کو ملا کر ایک نئی ترکیب گھڑی گئی تھی) کہا کرتی تھی۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسعود کی یہ دوستی دراصل دو خاندانوں بلکہ دو تہذیبوں کے علمبرداروں کی بھی یکجائی کی مظہر تھی۔

فوسٹر نے اپنا مشہور زمانہ ناول "A passage to India" مسعود ہی کی فرمائش پر تحریر کیا تھا۔ اور انھی کے نام منسوب بھی کیا۔[۲۱۴]

گزشتہ صدی کے انگریزی ادب کی تاریخ میں فوسٹر اور مسعود کی دوستی ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ فوسٹر نے راس مسعود کی ناگہانی موت (۳۱/جولائی ۱۹۳۷ء) پر جو مضمون تحریر کیا تھا اس کا عنوان ہے: "None was nor will be like him"[۲۱۵]

یوں تو راس مسعود کے انگریز دوستوں کی تعداد کافی ہے مگر فوسٹر ان میں سب سے قدیم تھے۔ فوسٹر نے مسعود پر اپنی تحریر میں بتایا ہے کہ ان کی دوستی تیس سال پر محیط تھی۔ فوسٹر کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> "Masood had many English friend but I may claim to see the oldest and most intimate of them. I have known him for thirty years, and we kept in touch the whole time". [۲۱۶]

فوسٹر۔ مسعود کی دوستی کے اس طویل عرصے میں طرفین نے نہ جانے کتنے ہی خط ایک دوسرے کو لکھے ہوں، لیکن وہ سب کے سب تو محفوظ نہیں رہ سکے۔ پیشِ نظر مجموعے کے خطوط بھی سابق لیڈی مسعود کی فراست ہی کے باعث محفوظ رہ سکے۔ اسی طرح فوسٹر کے نام مسعود کے کچھ خطوط۔ کیمبرج یونیورسٹی میں محفوظ تھے، جنھیں جلیل قدوائی نے بعض انگریز اسکالرز کی مدد سے جن کا تذکرہ آگے آئے گا، بہ نفس نفیس کیمبرج یونیورسٹی جا کر وہاں سے حاصل کیے۔

یہ بات بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ بیگم چھتاری (سابق لیڈی مسعود) ان خطوط کی اہمیت سے بخوبی واقف تھیں اور انھوں نے مشکل حالات میں بھی اپنے پہلے مرحوم شوہر کے تمام کاغذات کو سنبھالے رکھا۔ چناں چہ آپ ہی کی بدولت یہ خطوط ضائع ہونے سے بچ رہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ خود اس مطبوعہ مجموعے کو ملاحظہ نہ کر سکیں۔ چناں چہ جلیل قدوائی نے ان کی اس عظیم خدمت کے پیشِ نظر یہ کتاب ''بیگم امتل سعید

چھتاری'' ہی کے نام یوں منسوب کی ہے "To the memory of Begum Amtul's Chhatari"۲۱۷

جلیل قدوائی نے اپنے نام بیگم چھتاری کے ایک غیر مطبوعہ اُردو خط کا انگریزی ترجمہ بھی اس کتاب کے آغاز میں بعنوان:۲۱۸ "She Saved Forster Masood Letters" شامل کیا ہے۔ بعدازاں مرحومہ کے مذکورہ خط کا پورا متن بھی راس مسعود پر مختلف تحریروں کے ایک مجموعے ''اوراقِ گُل'' میں مع حواشی شائع کر دیا ہے۔۲۱۹ یہاں اصل متن سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے ''فوسٹر۔مسعود لیٹرز'' کو محفوظ رکھنے کے سلسلے میں ان کی کوششوں کا کچھ حال کھلتا ہے چناں چہ بیگم مرحومہ کے خط سے ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''۔۔۔ یہ میرا ہی کام تھا کہ ان خطوط کو ضائع نہیں ہونے دیا اور ہندوستان سے بصد مشکل واحتیاط پاکستان لے آئی اور برسوں لیے بیٹھی رہی۔ کسی اور کو اس کا نہ علم تھا اور نہ تجسس۔ اب البتہ سب اس میں سرگرداں نظر آتے ہیں''۔۲۲۰

جلیل قدوائی نے اس خط کے حواشی میں واضح کیا ہے کہ جب وہ ''فوسٹر۔مسعود لیٹرز'' کے سلسلے میں لندن میں فوسٹر کے شاگرد اور سوانح نگار پروفیسر پی، این فربینک (P.N.Furbank) سے ملے تو انھوں نے جلیل سے فوسٹر کے کچھ خطوط کی نقول بھی حاصل کیں۔ اسی موقع پر جلیل نے پی، این فربینک کے پاس مسعود کے نام فوسٹر کے کچھ خطوط بھی دیکھے تھے۔ چناں چہ آپ نے بیگم چھتاری سے اپنے ایک خط میں مذکورہ خطوط کی بابت یہ استفسار کیا تھا کہ مسٹر فربینک کے پاس یہ خط کیسے پہنچے؟ جواباً بیگم صاحبہ نے مذکورہ خط کے ذریعے جلیل قدوائی کو بتایا کہ اکبر مسعود (راس مسعود کے چھوٹے صاحبزادے اب مرحوم ہو چکے) اُن سے فوسٹر کے مذکورہ خطوط لے گئے تھے اور ان کی نقول مسٹر فربینک کو دی تھی۔

جلیل قدوائی جس وقت پروفیسر فربینک سے ملے تھے اس وقت وہ فوسٹر کے خطوط کئی جلدوں میں پروفیسر میری لاگو کی شراکت میں کیمبرج کی طرف سے مرتب کر رہے تھے۔ بقول جلیل قدوائی، فوسٹر بہت بڑا خطوط نویس بھی تھا اور اس کے کم وبیش دس ہزار میں سے منتخب کیے ہوئے ایک ہزار خطوط کئی جلدوں میں پیش کرنے کا منصوبہ تھا۔ مذکورہ سلسلے میں خطوط کی پہلی جلد شائع ہو چکی تھی دوسری جلد پر کام ہو رہا تھا۔۲۲۱

اب ذیل میں ''فوسٹر۔مسعود لیٹرز'' کے مشمولات (Contents) پر ایک نظر ڈالتے چلیں:

Acknowledgements		7
1	She 'Saved Forster-Masood Letter	15
2.	Preface	17

3	From a "Member of the rulling race" to A Nigger	39
4.	To "One of the quaintest fellows I have ever come across"	93
5.	Appendices:	
(i)	Syed Ross Masood and E.M.Forster by Dr. S.Hamid Hussain.	119
(ii)	Forster's obituary Tribute to Masood.	127
(iii)	English Translation of the Invitation card issued by Begum Justice Mahmood on the occasion of Masood's first marriage.	131
(iv)	A note on Begum Amtuls Chhatari.	133
(v)	A poem by Masood, "The Death of the Vain Rose" Written at Forster's home, West Hackhurst, 22.4.11.	139
(vi)	A poem by Masood, 'To be written on a book to be given to E.M.F on Xmas 1908"	141
(vii)'	To K.M.", a poem by Masood written at Tesserete, 3.8.1911.	143
(vii)	Some important dates in Forster Masood friendship.	145
6.	Notes.	157
7.	Bibliography.1	99

مندرجہ بالا فہرستِ مشمولات کے فوری بعد "Importnt Corrections" کے عنوان سے تصحیح نامہ دیا گیا ہے جس میں پینتیس مقامات پر پروف کی غلطیوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

سرورق پر فوسٹر اور مسعود کی ایک یادگار تصویر ہے جب کہ بیک ٹائیٹل پر راجستھانی پگڑی کے ساتھ ہندوستانی لباس میں فوسٹر کی ایک یادگار تصویر کا عکس ہے۔ "اظہارِ تشکر" (Acknowledgement) کے صفحات میں جلیل قدوائی نے ان معاون اشخاص، اداروں اور کتب و رسائل کا شکریہ ادا کیا ہے جن سے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں انھیں کسی بھی قسم کی مدد ملی ہے۔ ایسی معاون شخصیتوں میں بیگم چھتاری (کراچی)، آر، ڈبلیو نوبل (یوکے)، ڈاکٹر سیّد حامد حسین (انڈیا)، ڈاکٹر رابن جے، لیوس (امریکہ)، پروفیسر احمد علی، مسز انیس خان (پاکستان) اور پروفیسر پی، این فرینک (یوکے) شامل ہیں۔ ان

کے علاوہ جن حضرات نے کیمبرج یونیورسٹی سے راس مسعود کے نایاب خطوط کے ساتھ ساتھ فوسٹر کے خطوط کی اشاعت کے لیے، جن کا کاپی رائٹ کیمبرج یونیورسٹی کے پاس تھا۔ اجازت حاصل کرنے میں بھرپور مدد کی تھی، شکریہ ادا کیا گیا ہے۔

اب ذیل میں جلیل قدوائی کے مرتبہ اس مجموعے کا فن تدوین کی روشنی میں جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ مواد کی فراہمی:

جلیل قدوائی نے زیر تجزیہ کتاب کے لیے مواد کی فراہمی میں بہت کھکھیڑ اُٹھائی ہے۔ کیوں کہ اس مجموعے کا ہر خط اپنی جگہ ایک مستقل متن کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی کتاب ''متنی تنقید'' (Textual Criticism) میں ''متن'' کی تعریف کے سلسلے میں واضح کیا ہے کہ ''ہزاروں صفحوں پر پھیلی ہوئی تحریر ہو یا ایک صفحے کی مختصر تحریر دونوں متن ہو سکتے ہیں۔ اس ضمن میں آپ کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ''غالب کا ایک خط مرتب کرنے والے کے لیے چند سطروں کا خط بھی متن ہوگا''۔۲۲۲

چناں چہ اس روشنی میں جب جلیل قدوائی کی کوششوں پر نظر کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس مجموعے کے لیے کتنی محنت سے کام لیا ہے۔ اس کتاب کے لیے جلیل قدوائی نے جن شخصیات اور اداروں سے رجوع کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

☆ اُمت السعید [کذا: امتل] چھتاری ۲۲۳ سابق لیڈی مسعود (م: ۱۹۷۹ء، کراچی)، ۲۲۴

☆ کنگز کالج کیمبرج (یو کے) ۲۲۵

☆ ڈاکٹر احسان رشید (سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی، داماد سر راس مسعود اور اُردن میں پاکستان کے سابق سفیر)۔

☆ ڈاکٹر سیّد حامد حُسین (انڈیا) ۲۲۶

جلیل قدوائی نے ''مواد کی فراہمی'' کے سلسلے میں بتایا ہے کہ اس مجموعے کے بیشتر خطوط بیگم چھتاری (سابق لیڈی مسعود) کے ذخیرے سے فراہم ہوئے ہیں۔ جلیل قدوائی نے تحریر کیا ہے کہ ان کے ساتھ ساتھ کراچی یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر اے بی اے حلیم، ڈاکٹر احسان رشید اور بیگم چھتاری نے کئی کئی گھنٹے صرف کر کے راس مسعود کے ذخیرۂ کاغذات (مخزونہ بیگم چھتاری) سے یہ خطوط تلاش کیے ہیں۔ کچھ خطوط صرف ڈاکٹر احسان رشید نے مذکورہ ذخیرے سے ڈھونڈ کر جلیل قدوائی کے حوالے کیے۔ آپ نے ان خطوط کی تلاش و

فراہمی کے سلسلے میں مذکورہ حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

"I am grateful for sitting with me, at the latter's residence in Karachi, in the company of the Begum for many a long hour and at different intervals, in our effort to sort out from a large mass of Masood Papers, a number of Forster letters which were not even with her. To Dr. Ehsan Rashid, I am further grateful for letting me have a few more Forster letters collected by him from Masood Papers on his own".۲۲۷

۲۔مقدمۂ کتاب:

جلیلؔ قدوائی نے بائیس صفحات پر مشتمل اپنے مقدمے میں جن اُمور پر محققانہ روشنی ڈالی ہے اُن میں سرِ فہرست تو فوسٹر۔مسعود تعلقات ہیں۔علاوہ ازیں ''متنی محاسن'' تنقید متن اور تصحیح و تحقیق متن جیسے اُمور پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔

ترتیبِ متن کے سلسلے میں متنی نقاد کو مواد کی فراہمی کے بعد ''قرأت متن'' کا اہم مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔چوں کہ راس مسعود کی تحریر بھی گویا خطِ شکستہ کا ایک ایسا نمونہ تھی جسے پڑھنا آسان نہ تھا۔لہٰذا جلیلؔ قدوائی نے ان خطوط کی بامعنی قرأت کا پورا اہتمام کیا۔پیشِ نظر مجموعے کے صفحہ نمبر ۱۰۰ تا ۱۰۱ راس مسعود کی ایک قلمی تحریر کا عکس شائع کیا گیا ہے۔جسے دیکھنے کے بعد اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس تحریر کو کتنی مشکل سے پڑھا گیا ہوگا۔چناں چہ جلیل نے پاکستان میں اپنے بیٹے ڈاکٹر بختیار احمد ۲۲۸ اور میجر خالد قدوائی ۲۲۹ داماد سیّد بشیر الدین احمد ۲۳۰ سے ان خطوط کی ابتدائی ٹائپنگ میں مدد لی ہے۔کیوں کہ خود جلیلؔ قدوائی کا خط بھی بہت پیچیدہ ہے اور آسانی سے پڑھا نہیں جاسکتا۔جلیلؔ قدوائی نے اس اہم کام کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"It proved quite a difficult task in veiw of the illegibility of the letters, at many places, particularly in case of Masood's 'horribly badly written' letters, as he has himself put it, the draft was, however, most carefully gone through by me. The preparation of the typescript and final copy for the press of the entire book, in Pakistan was also by no means less exacting because of my own hopelessly shabby handwriting". ۲۳۱

اس مجموعے کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں جلیلؔ نے جن دیگر احباب اور اہلِ قلم کا شکریہ ادا کیا ہے اُن میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق، بیگم ممتاز رشیدی، جناب مرزا اظہر علی برلاس، جناب کنور محمد اعظم خان 'خسروی' کے علاوہ جناب ایس ایس جعفری، صدر راس مسعود، سوسائٹی شامل ہیں۔

علاوہ ازیں جن اداروں کی کتابوں سے فائدہ اُٹھایا گیا ہے، جلیلؔ قدوائی نے ان سب اداروں کا بھی شکریہ ادا کیا ہے۔ ان میں انجمن ترقی اُردو، Kings College cambridge, Messrs Martin Secker and Warburg Ltd, London, Messers Edward Arnold (Publishers) Ltd, London, Messrs. Thames and Hudson Ltd, London. شامل ہیں۔

متنی محاسن:

جلیلؔ قدوائی نے اپنے مقدمے میں جہاں ''فوسٹر۔مسعود'' تعلقات کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ وہیں ''فوسٹر۔مسعود لیٹرز'' کے ''متنی محاسن'' پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جس سے زیرِ تجزیہ کتاب کا جائزہ بھی مکمل ہو جائے گا۔

جیسا کہ ان خطوط کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو دوست اپنے ذاتی مسائل کے ساتھ ساتھ متعدد علمی اور دیگر معاملات پر کس، آزادانہ طریقے سے اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو اپنے پیش آمدہ واقعات اور حالات کی ستم ظریفی کی داستان بھی سناتے ہیں اور اپنے تجربات سے ایک دوسرے کو رہنمائی بھی فراہم کرتے ہیں۔

ان خطوط میں وہ دنیا کے قابلِ ذکر معاملات اور حالات پر صحت مند تنقید کے ساتھ ساتھ ظرافت کے چھینٹوں سے بھی لطف اندوزی کا سامان کرتے نظر آتے ہیں۔ جلیلؔ قدوائی نے ان خطوط کا موضوعاتی جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ:

"From the letters in this volume it will be seen that the two friends freely exchanged views on a lot of their personal problems as well as discussed intellectual and academic subjects between them. They wrote to each other about their various schemes their life's little ironies and all sorts of their experiences, with a view to receiving encouragement and consolation, and guidance, if

necessary. They also enjoyed between them a lot of fun, light humour and healthy criticism of men and matters of the world".۲۳۲

فوسٹر نے اپنے خطوط میں راس مسعود کو جن القابات سے مخاطب کیا ہے وہ بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان القابات سے فوسٹر کے دل میں مسعود کی اہمیت اور محبت کا بھی کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چناں چہ اپنے خطوط میں فوسٹر، مسعود کو My Dearest Boy, Dear Masood, My Dear Masood, dear Man, My Dearest Fellow, Dearest SRM جیسے بے تکلف دوستانہ القابات سے یاد کرتا ہے۔ اسی طرح راس مسعود نے بھی فوسٹر کے لیے جو القابات استعمال کیے ہیں ان میں Dear fellow, My dear Forster, My very dear Forster, My dearest Forster, My Dearest Morgan اور میرے پیارے فوسٹر جیسے القابات شامل ہیں۔

اب ذیل میں ای ایم فوسٹر کے خطوط سے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن سے ان دونوں شخصیات کے دوستانہ مراسم کے ساتھ ساتھ مشترکہ دل چسپیوں کے حامل علمی و ادبی موضوعات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

"Dear Masood,

As I write I wear your shoes!They are even more beautiful then. I expected and make Socks, and indeed the whole of me, look horribly dowdy and prosaic. Thank you so much. ۲۳۳

"I am reading Lyall's handbook about the English in India- The sort of thing I required. Also have failed to read another of Alice perrin's novels called Idolatary. The other I tried was good but this is about missionaries and wicked Hindus, and most tiresome". ۲۳۴

"What do you think I have been reading, and with the great interest?You will never guess: the life of your grandfather". ۲۳۵

اب راس مسعود کے خطوط سے بھی دو اقتباسات ملاحظہ کیجیے جس سے معلوم ہوگا کہ فوسٹر کا مشہور ناول: "A passage to India" کس طرح وجود میں آیا۔

راس مسعود، فوسٹر کو لکھتے ہیں:

"..You know my great wish is to get you to write a book on India, for I feel convinced from what I know of you that it will be a great book. I do not wish to flatter you in any way but the fact is that you are about the only Englishman in whom I have come across true sentiment and that too real sentiment even from the oriental point of view. So you know what it is that makes me love you so much; it is the fact that in you I see an Oriental with an oriental's view of life on most things and as the Frenchman has said, 'cultivez cultivez' etc, I say go on go on improving your imagination and with it your power of physicaly feeling the difficulties of another". ۲۳۶

راس مسعود نے اپنے ایک طویل خط میں فوسٹر سے اپنے نجی معاملات، خاندانی رسم و رواج، اور اپنی شادی کے متعلق بھی تفصیلی اظہارِ خیال کیا ہے۔ راس مسعود نے بتایا ہے کہ ایک انگریز کے مقابلے میں انھیں ملنے والی ماہانہ تنخواہ دو تہائی ہے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں کہ "I am to get only Rs.333/-" ۲۳۷

اسی طرح فوسٹر کو اپنی شادی کی دعوت دیتے ہوئے مشورہ دیتے ہیں کہ:

"Why don't you write a book and get £50 and come out and join my marriage in November?" ۲۳۸

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ان خطوط میں یہ دونوں دوست اپنی زیرِ مطالعہ کتابوں کے سلسلے میں بھی ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں راس مسعود کے خط سے مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

"By the way, I finished reading Anna Karenina for the first time last night. Morgan, it is a great book.shook me inside out. The description of the feelings of Lenin when he sees his wife Kitty in the throes of child birth is wonderful, and as for vronsky, well, he has my temperament. I have Seldom enjoyed at book more, ... The only defect in the book is the too hurried degeneration of Anna. I don't agree with it". ۲۳۹

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ راس مسعود اور فوسٹر کے تعلقات محض انھی تک محدود نہ تھے بلکہ دونوں خاندانوں کے درمیان بھی محبت اور خلوص کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ اس بات کی نشان دہی راس مسعود کی تحریر کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بخوبی ہوتی ہے:

"Dearest Morgan, you dont know how sincerely and earnestly I long for it. ... you and I will then really belong to one family, and all that I have will be yours".[۲۴۰]

الغرض ''فوسٹر۔ مسعود لیٹرز'' جلیل قدوائی کی ایک بہترین تدوینی اور تحقیقی کاوش ہے۔ اس کتاب پر آپ نے مجموعی طور پر ۲۳۱ سے زائد قیمتی حواشی لکھے ہیں۔ جن کے بغیر ان خطوط کا سمجھنا، ناممکن تھا۔ اسی طرح کتاب کے آخر میں غیر مطبوعہ اور مطبوعہ مآخذ پر مشتمل کتابیات (Bibliography) شامل ہے۔ علاوہ ازیں ضمیمہ جات (Appendices) کے اضافوں سے بھی جن کی تفصیل پہلے ہی فہرستِ مشمولات میں دی جا چکی ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک نہایت علمی، ادبی، تحقیقی اور جامع معلومات کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حوالہ جاتی دستاویز کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اس کتاب کی جستجو کرنے والوں میں شعبۂ انگریزی، نیویارک یونیورسٹی کے Professor Pegram Harrison بھی ہیں جنھیں جلیل قدوائی کی بڑی صاحب زادی ڈاکٹر پروین بشیر احمد (مقیم برطانیہ) نے ان کی درخواست پر اس کتاب کا ایک نسخہ فراہم کیا تھا۔[۲۴۱]

(۳:الف:ii) بیاض "REALMS OF GOLD"[۲۴۲]

جلیل قدوائی کی مرتبہ اس کتاب کے سلسلے میں چند باتیں پہلے واضح کرنا ضروری ہیں کہ:

۱۔ راس مسعود کی یہ کاوش ان کی ایک بیاض پر مشتمل ہے۔

۲۔ راس مسعود کے انتقال کے بعد یہ بیاض گم ہو گئی تھی۔

۳۔ جلیل قدوائی کو اس بیاض کا علم تھا لہٰذا وہ اس کی تلاش میں رہے۔

۴۔ تلاش بسیار کے بعد بالآخر یہ بیاض انھیں علی گڑھ سے دست یاب ہو گئی۔[۲۴۳]

۵۔ اس بیاض میں اُردو کے منتخب شعرا کا منتخب کلام انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

سر سیّد راس مسعود اُردو اور انگریزی ہر دو زبانوں کے شعر و ادب سے گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ قریبی احباب اور ان کی محفل میں بیٹھنے والے ان کے ذوق شعری کے متعلق بخوبی جانتے تھے کہ راس مسعود کا مذاق کس قدر بلند اور ستھرا تھا۔ چوں کہ ان کی محفلوں میں شریک ہونے کا اعزاز جلیل قدوائی کو بھی حاصل رہا

ہے۔لہٰذا ایک مقام پر راس مسعود کے ذوقِ شعری اور ان کے آرائش محفل ہونے پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ:

''ان کے شعروادب کے ذوق اور آرائش محفل ہونے کا بڑا شہرہ ہے اور یہ واقعہ ہے کہ جس محفل کی شمع وہ ہوتے اس میں کسی اور کا چراغ نہ جلتا۔۔۔ اُن کی شعرخوانی کا یہ عالم تھا کہ غالبؔ، انیسؔ، حالیؔ، اقبالؔ، بے نظیر شاہ، شادؔ عظیم آبادی، سعدیؔ، حافظؔ، خیامؔ کے ساتھ ساتھ انگریزی، فرانسیسی، اطالوی اور دوسری زبانوں کے اشعار جیسے صف بہ صف ان کے سامنے ہاتھ باندھے چلے آ رہے ہوں۔'' ۲۴۴

جیسا کہ واضح ہو چکا ہے کہ زیرِ نظر کتاب کا منظرِ عام پر آنا جلیلؔ قدوائی ہی کے مرہونِ منت ہے۔ آپ نے علی گڑھ میں راس مسعود کے گھر پر ایک نشست میں اس بیاض کے بعض تراجم خود مترجم کی زبانی سماعت کیے تھے۔ جلیلؔ قدوائی نے اس نشست کا حال بھی قلم بند کیا ہے۔ آپ کے اسی بیان سے ذیل میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایک بار 'یومِ سرسیّد' کے موقع پر سر شیخ عبدالقادر مرحوم یونیورسٹی کے مہمانِ خصوصی تھے، شام کو مسعود نے اپنی کوٹھی (انگلش ہاؤس) میں شیخ صاحب کو عصرانہ دیا۔ مجھے شیخ صاحب موصوف، ڈاکٹر ظفرالحسن مرحوم (صدر شعبۂ فلسفہ) اور مسعود کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس صحبت میں غیر رسمی طور پر مسعود نے ہم لوگوں کو مسدسِ حالیؔ کے چند بندوں کا اپنا کیا ہوا انگریزی ترجمہ اپنے مخصوص انداز میں سنایا۔ اس کے بعد اپنی پاٹ دار آواز میں اپنے پُرانے ملازم 'مقبول' کو بُلایا اور بیاض اس کے سپرد کر دی۔ میں نے اسے دیکھنا چاہا مگر اجازت نہ ملی۔'' ۲۴۵

مذکورہ بیاض کو دیکھنے کی جلیلؔ قدوائی کی تمنا لگ بھگ پچاس برس کے بعد بالآخر اس وقت پوری ہو ہی گئی جب وہ اس گم شدہ خزانے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ بعد ازاں آپ نے اس نادر بیاض کو افادۂ عام کی غرض سے بڑے اہتمام سے شائع بھی کیا۔ جس کی تفصیلات آگے آئیں گی۔ جلیلؔ قدوائی نے اس کے دیباچے میں تعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس بیاض کے بارے میں راس مسعود کے اہلِ خانہ کو بھی علم نہ تھا۔ مسعود کے انتقال کے بعد علی گڑھ میں کسی صاحب نے ان کے گھر والوں سے تمام کاغذات اور مسالا یہ کہہ کر لے لیا تھا کہ وہ ان پر کام کریں گے۔ لیکن ایک مدّت بعد بھی کوئی کام نہ ہوا۔

چوں کہ جلیلؔ قدوائی کو اس بیاض کا علم تھا لہٰذا وہ اس کی جستجو میں لگے رہے، لہٰذا جب ڈاکٹر احسان رشید ''بہ ہزاراں ہزار دقتوں سے'' ۲۴۶ مسعود صاحب کے مسودات اور کاغذات واپس لینے میں کامیاب ہو گئے تو انھی کاغذات اور مسودات میں یہ بیاض بھی برآمد ہوئی۔ بیاض دیکھنے سے یہ خوشگوار انکشاف ہوا کہ یہ

صرف حالی ہی کے منتخب کلام کے انگریزی تراجم پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں دیگر منتخب شعرائے اُردو کے منتخب کلام کے تراجم بھی ہیں۔ چناں چہ جلیل قدوائی نے لیڈی مسعود کی اجازت سے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ ذیل میں جلیل قدوائی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> "Years rolled by. I left Aligarh ..... Then came the 'Great Divide' and when, after coming to Pakistan, I met my revered Lady Masood, who had by then become Begum A.S. Chhatari (now deceased, alas!) I was surprised to learn that she had no idea of any 'Bayaz' that I spoke to her about. However, she graciously agreed to find time for both of us to sit together to go through a mass of papers left by Sir, Ross; and Lo and behold, as luck would have it, one day the invaluable treasure we were after was in our hands. It was also discovered that it did not contain the English translation of selections from Hali alone but that it was a collection of Sir Ross, translation from a number of other selected Urdu poets. How both of us were overjoyed it is beyond words to express. She was generous enough, later, to let me have a copy of the MS and also permit me to publish the same if I chose to do so".[۲۴۷]

اس تمہیدی پس منظر کے بعد اب ذیل میں اس کتاب کے مشمولات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

یہ کتاب چھوٹے سائز کے ۱۴۰ر صفحات پر محیط ہے۔ سرورق پر سر راس مسعود کی تصویر ہے۔ پسِ سر ورق کتاب کے مرتب کا تعارف مع تصویر ہے۔ اس کی کمپوزنگ، طباعت اور ترتیب میں جلیل قدوائی کا سلیقہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ایک باوقار پیش کش کہی جاسکتی ہے۔ کتاب کے آخر میں اغلاط نامہ "Errata" بھی دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں صرف اٹھارہ مقامات پر پروف کی اغلاط رہ گئی ہیں۔ جنھیں اس فہرست سے دیکھ کر درست کیا جاسکتا ہے۔ کتاب کی قیمت ۵۰/روپے درج ہے۔ یہ ۱۹۸۶ء میں ''ٹیکنیکل پرنٹرس کراچی'' کے پریس میں چھپی ہے۔ اندرونی ٹائٹل پر کتاب کے عنوان کے نیچے قوسین میں یہ درج ذیل عبارت درج ہے جس سے کتاب کے مشمولات پر روشنی پڑتی ہے۔ مذکورہ عبارت ملاحظہ ہو:

"Realms of Gold"

(Translation into English verse of selections from some Urdu Poets)

by

Nawab Masood Jung

Dr, Sir Syed Ross Masood

B.A (Oxon), Bar-at-Law, LLD, D.Lit, etc.

Edited by

Jalil Ahmed Kidwai, M.A

اس کتاب کو مرتب نے علی گڑھ میں خواجہ منظور حُسین (م:۱۹۸۶ء، لاہور) سے اپنے قریبی روابط اور یادوں کے حوالے سے منسوب کرتے ہوئے مندرجہ ذیل الفاظ میں موصوف کا جامع تعارف بھی پیش کیا ہے۔

"To the memory

of

Khwaja Manzoor Hussain

and

our close association

during Aligarh day's".

انتساب کے بعد مشمولات کی فہرست "Contents" پیش کی گی ہے بعد ازاں دیباچہ "Foreword" ہے۔ جس میں راس مسعود کے حوالے سے کچھ گفتگو کے علاوہ اس بیاض سے متعلق بھی بعض اہم معلومات پیش کی گئی ہیں۔

آگے بڑھنے سے قبل "Contents" پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔ ملاحظہ ہو:

Contents

Foreword		11
[1] اکبرالہ آبادی / Akbar Allahabadi.		-
(i)	آفتاب.....	17
(ii)	نمازِ چمن.....	18
(iii)	رباعی.....	19
(i)	The sun	20
(ii)	The gurden's prayer.....	21

(iii) Quatrain..... 23

[2] انیس/ Anis .....

(i) رباعیات..... 24

(ii) نمودِ صبح..... 24

(iii) برگ پسر..... 28

(iv) منزل دنیا..... 29

(v) صبح کربلا..... 30

(i) Quatrains..... 32

(ii) The apparition of Dawn 35

(iii) A Son's Death..... 37

(iv) The world..... 38

(v) The Dawn of Karbala..... 40

[3] آتش / Atish .....

حمد..... 42

In Praise of GOD..... 42

[4] دبیر / Dabir .....

رباعیات..... 44

Quatrians..... 45

[5] غالبؔ/Ghalib

(i) بزمِ عشرت..... 46

(ii) بہ حضور شاہ..... 47

(iii) متفرقات..... 51

(i) Pleasure's Halls..... 52

(ii) Petition to the Emperor..... 53

(iii) Miscellaneous................. 56

[6] حالیؔ/ Hali:-

(i) یقین................. 59

(ii) مرثیۂ غالب................. 60

(iii) رباعیات................. 62

(iv) مدو جزر اسلام................. 65

(i) Faith................. 74

(ii) ELegy on Ghalib................. 75

(iii) Quatrains................. 77

(iv) Ebb and Flow of Islam................. 80

[7] اقبالؔ/ Iqbal :-

(i) چاند................. 90

(ii) ایک آرزو................. 92

(iii) ایک پرندے کی فریاد................. 94

(i) The Moon................. 98

(ii) A prayer................. 102

(iii) The Bird's Lament 105

[8] اسماعیل میرٹھی/Ismail Merathee:

خوابِ راحت................. 109

Sleep................. 112

[9] مومنؔ/ Momin:

عشرت فانی................. 116

Fleeting Pleasure................. 118

[10] رندؔ/Rind:

تین شعر 121
Three Couplets..... 121
[11] شوق قدوائی/Shaoq Kidwai:
(i) حمد..... 123
(ii) حب وطن..... 124
(iii) In praise of God..... 127
(ii) Love of country 129
[12] ذوق/Zauq:
(i) متفرقات..... 131
(ii) رباعی..... 131
(i) Miscellaneous..... 132
(ii) Quatrain..... 133
[13] محسن کاکوروی / Mohsin Kakorvi:
مناجات 134
Invocation to the prophet 136
[14] شعرآوارہ / Awandering verse 139
[15] Errata..... 140

اس فہرست پر ایک نظر ڈالتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ گویا اس مختصر سی کتاب کے ذریعے اُردو شاعری کا عطر پیش کیا گیا ہے۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ انھیں بہترین انگریزی لباس میں پیش کر کے عالمی سطح پر اُردو شعرا کو متعارف کرایا گیا ہے۔

دیباچے کے آخر میں جلیل قدوائی نے اپنے جن دوستوں کا شکریہ ادا کیا ہے اُن میں مشفق خواجہ اور محمد مسلم رضوی شامل ہیں۔ آپ نے اپنے بیٹوں لیفٹیننٹ کرنل خالد قدوائی (اب ریٹائرڈ لیفٹننٹ جرنل) اور ڈاکٹر بختیار جلیل قدوائی کے تعاون پر دعاؤں سے نوازا ہے۔ یہ کتاب اکیڈمی آف لیٹرز (Academy of Letters) کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے چناں چہ اس کا شکریہ بھی ادا کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ایس ایس جعفری اور سیّد ہاشم رضا کی حوصلہ افزائیوں کا بھی شکریہ ادا کیا ہے۔ واضح رہے کہ اوّل الذکر راس مسعود

سوسائٹی کے صدر اور ثانی الذکر دائمی رکن (life member) تھے۔

اب ذیل میں بطور مُشتے نمونہ از خروارے "Realms of Gold" سے راس مسعود کے منظوم تراجم کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

نمازِ چمن

کیا پھولوں نے شبنم سے وضو صحن گلستاں میں — صدائے نغمۂ بُلبل اُٹھی بانگ اذاں ہوکر
ہوائے شوق میں شاخیں جھکیں خالق کے سجدے کو — ہوئی تسبیح میں مصروف ہر پتی زباں ہوکر
زبان برگ گل نے کی دعا رنگیں عبارت میں — خدا سرسبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہوکر

(اکبرالہٰ آبادی)

The Garden's Prayer

All the blossoms throughout the garden
Morn's ablution with dew prepare,
while the nightingales lift their voices,
Calling Nature to morning Prayer.

Branch and spray, to the great creator
Bend them low in an ecstacy;
Every leaf is a tongue, intently
Telling over its rosary.

Hark the tongue of the rose's Petals
Pouring floridly forth the Prayer:
"O, may Allah in tender mercy
Bless our garden, and keep it fair!"

(Akbar Allabadi)

انیسؔ: ''صبحِ کربلا''

ہاں غازیو، یہ دن ہے جدال و قتال کا
یاں خوں بہے گا آج محمد کی آل کا
چہرہ خوشی سے سُرخ ہے زہرا کے لال کا
گزری شب فراق دن آیا وصال کا

ہم وہ ہیں غم کریں گے فلک جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

The Down of Karbala

"Ye braves! Lo, this the day of deadly strife!
This day Muhammad's sons their blood shall shed.
(With joy is flushed the son of Ali's wife,
For union downs, the night of parting fled)
For us shall angels hence in sorrows languish
For this to-day were all our nights of anguish."

(Anis)

آتش: حمد

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جُدائی کا

" In Praise of God"

Thy friendship I boast, though a bubble I be,
Nay, this drop sore laments its divorce from the sea!

(Atish)

غالبؔ: ''بزم عشرت''

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

"Pleasure's Halls"

Only a candle left, and its heart crushed
To have the guests depart - all charred and hushed.

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

Fortune Seeketh to erase me,
wherefor, Lord, and why?
Not a mere redundant letter
on lif's page am I!.

کوئی اُمید بر نہیں آتی　　کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ　　شرم تم کو مگر نہیں آتی

No hope is fulfiled,　　No gleam e'er appears!
I laughed at myself once,　　Now Mirth never nears.
How face now the Ka'ba?　　Ah, Ghalib! blush hot!"
(Ghalib)

حالیؔ: "مدوجزر اسلام"

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

"Ebb and flow of Islam".

The destined surname Rahmat he obtained.
Through whom the poor at last their hope now gained,
The helper he of strangers in their woe,
Who aye to all did sweet compassion show,
In whom the weak, the slave, the fatherless
Were sure a friend and refuge to Passess.

ان مثالوں پر اکتفا کرتے ہوئے اب اس نادر و نایاب بیاض کی تدوینی خوبیوں کو ذیل میں اختصار سے بیان کیا جاتا ہے۔

☆ جلیلؔ قدوائی نے اس بیاض کی ترتیب میں رسمیات تدوین کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ مثلاً:
☆ متن کی بامعنی قرأت کا اہتمام نظر آتا ہے۔
☆ حواشی میں کلامِ اقبالؔ کے ابتدائی اور مروجہ متنوں کے اختلاف کی نشان دہی کی گئی ہے۔

☆ مقدمے میں راس مسعود کی قلمی بیاض کی دریافت و بازیافت کا مفصل احوال بیان کیا گیا ہے۔
☆ قلمی بیاض کے حصول کے ذرائع بھی بیان کیے ہیں۔
☆ بیاض میں شاعروں کے ناموں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے حروفِ تہجی کے مطابق مرتب کیا گیا ہے۔

الغرض جلیل قدوائی کی بدولت راس مسعود کی یہ نایاب ''بیاض'' نہ صرف محفوظ ہوگئی بلکہ یہ جسے اُردو شاعری کا عطر کہا جاسکتا ہے انگریزی خواں طبقے نیز مغرب کے لیے بیش بہا تحفہ کہا جاسکتا ہے۔علاوہ ازیں یہ ذو لسانی کتاب ترتیب و تدوین کے شعبے میں ایک اچھی مثال قائم کرتی نظر آتی ہے۔

(۳:ج:iii) ڈائری:"Travels in Japan" ۲۴۸ (Diary of an Exploring Mission)

راس مسعود کے ذاتی کاغذات کے سلسلۂ اشاعت میں ان کی نہایت اہمیّت کی حامل ایک ڈائری بھی ہے جسے جلیل قدوائی نے اپنے دیباچے (Preface) اور ضروری حواشی کے ساتھ اکادمی ہٰذا سے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا۔اس ڈائری پر جامعۂ کراچی یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر اے بی اے حلیم ۲۴۹ کا تعارفی مضمون (Introduction) بھی راس مسعود کے بارے میں مفصل معلومات فراہم کرتا ہے۔آگے بڑھنے سے قبل اس کے "Contents" پر ایک نظر ڈالتے چلیں:

Contents

1. Preface
   Jalil Ahmed Kidwai.. (xi)
2. Introduction
   Professor A.B.A. Haleem .... (xv)
3. Travels in Japan
   (Diary, March 9, to July 13, 1922) 3-86
4. Interviews and notes:
   (i) Educational Organization in Kanagawa Prefecture. 89-118
   (ii) Evolution of Scientific Terminology. 119-120
   (iii) Use of Technical Terms in Japanese. 121-122
   (iv) The Tokyo Imperial University. 123-125
   (v) New learning: Keio and Waseda Universities. 127-131
   (vi) Industrial Continuation Schools. 133-136
   (vii) Commerical Education in Japan. 137-140
   (viii) Modern Japan. 141

	(ix)	Educational Aims at Various Levels.	143-145
	(x)	Education in Japan.	147-156
	(xi)	Difference in Japanese and European Conceptions of Education.	157-158
	(xii)	A Diary within a Diary.	159-162
	(xiii)	Culture and Education in old Japan.	163-164
	(xiv)	Points From History of Japan.	165-167
	(xv)	Survey of Education since Restoration.	169-174
	(xvi)	Japan's Foreign Relations.	175-176
5.	**Experiment and Experience**		
	(i)	National Education: A Bold Experiment.	179-205
	(ii)	The Soul of Japan.	207-209

LIST OF ILLUSTRATIONS

1.	Nawab Masood Jung Dr. Sir Syed Ross Masood	....Frontispiece.
2.	Allama Iqbal's telegram to Begum Justice Syed Mahmood on the demise of Sir Ross.	(vi-vii)
3.	Facsimile of a page of Sir Ross' diary.	4-5
4.	Fujiyama: "Earth's Passionate endeavour to clasp the Great unknown".	22-23
5.	Facsimile of a letter of Mr, E. Hamilton Holmes, British Counsul General at Yokohama, addressed to Sir Ross.	26-27
6.	The Ginza - Then and Now.	28-29
7.	Sir Ross in Japanese Kimono.	58-59
8.	Deer Park.	80-81

اس ڈائری کے مشمولات پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اب اس کے جائزے کی طرف آتے ہیں۔ حیدرآباد دکن میں اصلاح تعلیم اور جامعہ عثمانیہ کے قیام کی تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ وہاں کے ''نظامت تعلیم'' نے ابتدائی مدارس کی توسیع و ترویج کے لیے کس قدر کوششیں کیں۔ اس ضمن میں نواب عمادالملک سیّد حُسین بلگرامی اور پھر ڈاکٹر المالطفی آئی سی ایس جیسے ماہر تعلیم کی کوششیں بھی ریکارڈ پر ہیں ان کے بعد جب نواب مسعود جنگ، سر راس مسعود ناظم تعلیمات ہوکر حیدرآباد آئے تو یہاں کا شعبۂ تعلیم پہلے سے زیادہ فعال اور مفید ہوگیا۔ راس مسعود کو علمی اور تعلیمی معاملات سے بے انتہا دلچسپی تھی۔ چناں چہ آپ نے اس

شعبے کی ترقی کے لیے بڑے خلوص کے ساتھ کوششیں شروع کردیں جس کے نتیجے میں پہلے ۱۹۱۸ء میں دارالترجمہ اور ۱۹۱۹ء میں جامعۂ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا۔[۲۵۰]

جناب تحسین سروری کے بقول تحتانی اور وسطانی مدارس کو بہتر بنانے کے لیے سررشتۂ تعلیم کے عہدہ داروں کو ابتدائی تعلیم کے بنیادی وسائل سے وہ واقفیت حاصل کرنے کے لیے بیرونِ ملک بھیجا گیا تھا اس سلسلے میں میسور، ٹروانکو، کوچن کے علاوہ براعظم یورپ کی عام تعلیم کے مشاہدے کے لیے بھی نمائندے بھیجے گئے تھے۔ تاکہ وہ ابتدائی اور لازمی تعلیم کے لیے اپنی رپورٹس اور سفارشات حکومتِ حیدرآباد کو پیش کرسکیں۔

چناں چہ اسی منصوبے کے تحت سر راس مسعود نے بھی جاپان کا سفر اختیار کیا۔ جاپان سے واپس آنے پر انھوں نے انگریزی میں ایک ضخیم رپورٹ مرتب کی جو ۱۹۲۳ء میں شائع بھی ہوئی۔ نیز اسی سال انجمن ترقی اُردو نے اس رپورٹ کا اُردو ترجمہ ''جاپان اور اس کا تعلیمی نظم ونسق'' کے نام سے چھاپا۔[۲۵۱]

پروفیسر اے بی اے حلیم نے اس ڈائری کے آغاز میں اپنے ''تعارف'' میں بتایا ہے کہ راس مسعود نے دو مرتبہ جاپان کی سیاحت کی تھی ایک بار اوّل الذکر مقصد کے لیے اور دوسری مرتبہ خالص تفریحی مقصد سے۔ پیشِ نظر ڈائری کی تاریخوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس دورۂ جاپان میں راس مسعود کا قیام تقریباً سوا چار مہینے کے قریب رہا۔ آپ ۹/مارچ ۱۹۳۲ء کو حیدرآباد سے روانہ ہوئے، ۱۰/مارچ کو بمبئی پہنچے، وہاں سے ۱۲/مارچ کو 'واکا سامارو' نامی جاپانی جہاز سے جاپان روانہ ہوئے۔ ۲۳/مارچ کو سنگاپور پہنچے اس طرح وہ کئی ساحلی شہروں پر اترے اور وہاں کی سیر کرتے ہوئے خاص جاپان پہنچے۔[۲۵۲]

جیسا کہ پروفیسر اے بی اے حلیم کے تعارف کے حوالے سے پہلے بتایا جاچکا ہے کہ راس مسعود دو مرتبہ جاپان گئے تھے۔ اس ضمن میں جلیل قدوائی نے بھی اپنے دیباچے میں راس مسعود کے ایک لیکچر کے حوالے سے بتایا ہے کہ جاپان میں ان کے مذکورہ دونوں اسفار کے قیام کا مجموعی عرصہ نو ماہ کے قریب ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ عرصہ کسی قوم کی ترقیوں اور کامیابیوں کے مطالعے اور مشاہدے کے لیے ایسا کم بھی نہیں ہے۔ جلیل قدوائی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> "....The total period of his stay in that country, as mentioned by him in his learned lecture on Japan, extracts from which have also been appended at the end of the Diary, was nine months". [۲۵۳]

پروفیسر اے بی اے حلیم نے اپنے ''تعارف'' میں راس مسعود کے دونوں اسفار کی غرض وغایت کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ پہلا دورہ خالص مطالعاتی نوعیت کا تھا جب کہ دوسرا تفریحی۔ پہلے دورۂ جاپان

کے اختتام پر راس مسعود کی تیار کردہ رپورٹ کا خصوصی تذکرہ بھی آپ کے تعارف میں آ گیا ہے اس تحریر سے ایک مختصر اقتباس ملاحظہ کرتے چلیں۔

پروفیسر اے بی اے حلیم اپنے ''تعارف'' میں رقم طراز ہیں کہ:

"The first journey was undertaken for the purpose of studying the educational system of Japan, the second was purely recreational. The results of the first trip were presented to the Hyderabad Government on his return in the form of a report (the Urdu version of which, bearing the title of ''جاپان کا تعلیمی نظم ونسق'' is still available) and are now being presented to the public in the form of this book of the second trip were possess no record...." ۲۵۴

مندرجہ بالا اقتباس کے آخر میں راس مسعود کے روزنامچے (Diary) کا ذکر کچھ تفصیل کا محتاج ہے۔ چناں چہ ذیل میں اس کے بارے میں کچھ ضروری تفصیلات سامنے لائی جاتی ہیں جس سے اس کتاب کی قدر و قیمت کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

جلیل قدوائی نے اپنے دیباچے میں اس ڈائری کی بازیافت اور اشاعت کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ کس طرح انھیں یہ نادر و نایاب ڈائری بیگم نادرہ احسان رشید سے ملی چوں کہ موصوفہ راس مسعود سوسائٹی کی ایک سرگرم رکن بھی تھیں لہٰذا انھوں نے خود ڈائری اشاعت کے لیے سوسائٹی کو پیش کر دی تھی۔ اس ڈائری کے حصول کے سلسلے میں جلیل قدوائی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"The Mss of the Diary and the material included in the 'Interviews and Notes', comprising several large volums, in Sir Ross' own hand, rather illigible at places, as also the remaining stuff included, are the property of his only daughter, ... Nadira, Now Begum Ehsan. As Honorary Secretary of the Ross Masood Education and Culture Society of Pakistan, which has the honour of presenting the Diary to the public.". ۲۵۵

جلیل قدوائی اپنے دیباچے میں آگے چل کر اس ڈائری کی ایک نقل فراہم کرنے کے سلسلے میں ڈاکٹر ممتاز حسن کا بھی شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"My heartfelt thanks are also due to that great scholar

and benefactor, Dr. Mumtaz Hassan, S.P.K., LLD, who as Managing Director of the National Bank of Pakistan was good enough to present, for preservation in the Ross Masood Library....the photo-stat copies of the Diary and its appendices".۲۵۶

اسی طرح اپنے دیباچے میں جلیل قدوائی نے اس ڈائری کا موضوعاتی تجزیہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اگرچہ اس کا موازنہ تعلیمی نظام کے مطالعے پر مشتمل ہے مگر اس میں عام لوگوں کی بھی دل چسپی کا سامان موجود ہے۔ چناں چہ اس ڈائری کے مندرجات کے ذریعے پڑھنے والے کو جاپان کی اس زمانے کی تعلیمی، ثقافتی، معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی، زندگی کے مرقعے نظر آتے ہیں۔ چناں چہ ذیل میں اس ڈائری کے دیباچے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"Not with standing all this and depicting, as it does, the conditions of that country about half a century ago, the Diary hardly seems to be an out-moded, fact - loaded book of history; insted, it has the freshness and charm, so to say, of a contemporary novel. The reason is that besides educational matters, it concerns itself, to a very considerable extent, with the more abiding aspects of Japan. The social and cultural pattern of the Japanese; their customs, practices and general behaviour; their philosphy of life, their love of art and beauty; the order and cleanliness in their homes; the 'aesthetic feast', accompanied by strains of the samisen and songs of the 'geishas' and their inns,___... the other aspect of the Diary relating to such subjects as the history of Japan, her educational organisation, the evolution of learning in that country etc. ۲۵۷

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس ڈائری میں یہ تنوع اس لیے پیدا ہو سکا کہ اس کے لکھنے والے نے اس سفر میں خود کو بیک وقت طالب علم اور نقاد کی حیثیت دے رکھی تھی۔

راس مسعود نے ڈائری کے آغاز ہی میں اس سفر کی غرض و غایت کو واضح کرتے ہوئے اپنی بابت لکھا ہے کہ وہ ایک نقاد اور طالب علم کی حیثیت سے جاپان جا رہے ہیں۔ آپ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"I am going to Japan partly as a critic and partly as a student, I went to understand the secret of Japans, wonderful progress.". ۲۵۸

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے کہ اس ڈائری کے ذریعے راس مسعود کے سفر جاپان کی جھلکیاں ہی نہیں نظر آتیں بلکہ وہاں کے لوگوں کے رہن سہن، اندازِ فکر، مذہبی اور روحانی وابستگی، فنونِ لطیفہ سے دل چسپی، اندازِ تعمیر، قومی ترقی کا حال اور پیشِ آمدہ مشکلات مثلاً زلزلے کا آنکھوں دیکھا حال بھی نہایت جامع طریقے سے بیان ہوا ہے۔

تحسین سروری نے بھی اس ڈائری کے متنوع موضوعات اور مندرجات کے حوالے سے بجا لکھا ہے کہ:

''چوں کہ روزنامچہ نجی حیثیت کا حامل تھا اس لیے اس میں جاپانیوں کے متعلق وہ تمام جزئیات ملتی ہیں جن کا کسی اور تصنیف میں ملنا دشوار ہے۔۔۔۔اس میں جاپان کی قدیم و جدید تاریخ، جغرافیائی حالات، وہاں کے لوگوں کی بود و باش اور ان کی مادّی و روحانی ترقی کی تفصیل بھی راس مسعود کے روزنامچے میں موجود ہے۔ مغربی علوم و فنون کی تحصیل اور جاپانی قوم کی انفرادی شان کے قیام کے صحیح اسباب بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اس طرح جاپان کے متعلق ایک غیر جاپانی مصنف کی غالباً یہ پہلی مستند کتاب ہے۔''۲۵۹

اس ڈائری کے صفحہ نمبر ۴ پر راس مسعود کی تحریر کا عکس بھی دیا گیا ہے جسے دیکھ کر جلیل قدوائی کی محنت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سر راس مسعود کی تحریر پڑھنا اور اس کے متن کو اشاعت کے لیے تیار کرنا یقیناً آسان کام نہ تھا لیکن جلیل قدوائی نے اپنی دل چسپی اور محنت سے نہ صرف اس ڈائری کا متن پڑھا بلکہ حسبِ ضرورت حواشی و تعلیقات کا اضافہ کیا۔ علاوہ ازیں اپنے دیباچے میں 'متنی محاسن' پر نہایت جامع انداز سے گفتگو کی ہے۔

اس ڈائری کے آغاز میں پروفیسر اے بی اے حلیم کا تعارف بھی نہایت اہم ہے جو راس مسعود کے خاندانی حالات سے لے کر ان کے سفر جاپان تک کے حالات کا احاطہ کرتا ہے۔

یہ کتاب دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصّہ روزنامچوں پر مشتمل ہے جب کہ دوسرے حصّے میں مباحثے اور یادداشتیں "Interviews and Notes" ہیں۔ آخری روزنامچے پر ۱۳ر جولائی ۱۹۲۲ء کی تاریخ ہے اور یہ نامکمل ہے۔ کیوں کہ اس کے آخر میں "Incomplete" تحریر ہے۔

صفحہ ۸۷ سے کتاب کا دوسرا حصّہ شروع ہوتا ہے جس میں راس مسعود نے بعض جاپانی اکابر اور اہلِ

فن سے اپنی ملاقاتوں کا احوال درج کیا ہے۔ الغرض جلیلؔ قدوائی کی اس تدوینی کاوش سے جہاں ان کے تحقیق وتدوین کے فن پر دست رس ظاہر ہوتی ہے وہیں اس کی اشاعت سے جاپان اور جاپانیوں کے بارے میں ایک عالمانہ تصنیف کا بھی اضافہ ہوتا ہے۔

جلیلؔ قدوائی نے دیباچے کے آخر میں جن معاونین کا شکریہ ادا کیا ہے اُن میں پروفیسر اے بی اے حلیم، جناب قدرت اللہ شہاب، جناب کے سرور حسن کے علاوہ جلیلؔ قدوائی کی اہلیہ ہرمزی بیگم اور ایک صاحبزادے منصور احمد جلیل شامل ہیں۔

آخرالذکر نے کتاب کا اغلاط نامہ تیار کیا ہے جو فہرست سے قبل "Important Corrections" کے عنوان سے شاملِ کتاب ہے۔ اس ڈائری کی اشاعت کے سلسلے میں جناب قدرت اللہ شہاب کی وساطت سے مرکزی حکومت کی جانب سے مبلغ -/10,000 روپے کی امداد ملی تھی جس کا جلیلؔ قدوائی نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

اس ڈائری کی اشاعت پر خواجہ غلام السیدین نے جلیلؔ قدوائی کو رسید دیتے ہوئے لکھا تھا کہ: ''اس سے راس مسعود صاحب کی بیدار مغزی قوتِ فکر اور ذہنی جرأت کا نقش اور زیادہ گہرا ہو گیا۔''۲۶۰

(۳:ب): راس مسعود کی شخصیت اور کارناموں سے متعلق جلیل قدوائی کے مرتبہ مضامین کے مجموعے یہ ہیں:

(i) مجلّہ یادگارِ مسعود (اُردو۔انگریزی)

(ii) ''مرقعِ مسعود'' (اُردو۔انگریزی)

(iii) ''خیابانِ مسعود'' (اُردو۔انگریزی)

(iv) ''شعلۂ مستعجل'' (اُردو۔انگریزی)

(v) ''اوراقِ گُل'' (اُردو۔انگریزی)

اب ذیل میں بالترتیب ان کتابوں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

(۳:ب-i): ''مجلّہ یادگارِ مسعود'' (اُردو۔انگریزی Souvenir)۲۶۱

راس مسعود کی شخصیت اور خدمات کو اُجاگر کرنے کے سلسلے میں پہلے یومِ راس مسعود منعقدہ ۳ مئی ۱۹۶۴ء کے موقع پر یہ مجلّہ شائع کیا گیا۔ جسے جلیل دوائی نے بڑے سلیقے اور باوقار انداز سے مارچ۔اپریل ۱۹۶۴ء میں پیش کیا۔ بڑے سائز کے اس ذولسانی (اُردو انگریزی Souvenir) مجموعے کے ۷۰ صفحات پر چھوٹی بڑی چوبیس (چودہ اُردو + دس انگریزی) تاثراتی تحریریں شائع کی گئی ہیں۔

علاوہ ازیں اس مجلّے میں کچھ یادگار تصاویر، منتخب اقتباسات اور تعزیت ناموں کے ساتھ ساتھ یومِ

راس مسعود کے حوالے سے چند پیغامات بھی شریکِ اشاعت ہیں۔

چوں کہ اس مجلّے کے تمام اہم مضامین ''مرقعِ مسعود'' میں شامل کر دیئے گئے ہیں لہٰذا تکرار سے بچتے ہوئے ان تحریروں کا جائزہ ''مرقعِ مسعود'' کے مطالعے کے دوران ہی لینا مناسب ہوگا۔

(۳:ب-ii): ''مرقعِ مسعود'' (اُردو۔انگریزی) ۲۶۲

اس کتاب سے ''راس مسعود اکادمی'' کے سلسلہ اشاعت کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ یہ مجموعہ دوسرے ''یومِ راس مسعود'' منعقدہ ۲۹/ مئی ۱۹۶۶ء کے موقع پر پیش کیا گیا۔ چناں چہ اس پہلی کڑی کو ''سلسلۂ مطبوعات راس مسعود نمبر ا'' قرار دیا گیا ہے۔ اس کی ضخامت (۱۸۶ اردو+ ۵۹ انگریزی) ۲۴۵ صفحات ہے۔ اور یہ راس مسعود کی صاحبزادی نادرہ اور ان کے فاضل شوہر احسان رشید کے نام معنون کیا گیا ہے۔

جلیلؔ قدوائی کے مرتبہ اس مجموعے کی اشاعت پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے درست فرمایا ہے کہ ''اس آئینے میں ہمیں صرف راس مسعود کے ہی خدوخال نظر نہیں آتے بلکہ انیسویں صدی کے نصف اوّل کی تہذیب اور کلچر کی ایک ایسی جھلک ملتی ہے جو ہم میں خود اعتمادی اور عزتِ نفس پیدا کرتی ہے۔''۲۶۳

اس مجموعے کے مشمولات پر ایک نظر ڈالنے سے بھی اس کی قدر و قیمت کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ چناں چہ اس کی فہرستِ مضامین ملاحظہ ہو:

فہرست

گزارش	مُرتّب	۹
تعارف	اختر حسین (ہلالِ پاکستان) صدر انجمن ترقی اُردو	۱۱
ارشادات	سر سیّد راس مسعود مرحوم	۱۵
قطعۂ تاریخ وفات	سیّد ہاشمی فرید آبادی	۲۰
سیّد راس مسعود مرحوم (نظم)	علامہ اقبال	۲۱
چند روزِ مسعود	سر شیخ عبدالقادر	۲۳
سیّد راس مسعود	بابائے اُردو	۳۰
یادِ ایّام	عبدالرزاق کانپوری	۴۷

مرثیہ نواب مسعود جنگ (نظم)	چودھری خوشی محمد خاں ناظر	۵۱
سرراس مسعود، اور اُردو ادب	نظامی بدایونی	۵۴
"سرسیّد ہاؤس کے کھنڈر سے"	رشید صدیقی	۶۶
مسعود مرحوم کی زندہ دلی	ڈاکٹر سیّد عابد حسین	۷۱
مرثیہ راس مسعود (نظم)	ابوالاثر حفیظ	۸۲
علی گڑھ میں سرراس مسعود کا کام	خواجہ غلام السیدین	۸۳
سرراس مسعود سے	میاں بشیر احمد	۱۰۸
مسعود مرحوم (نظم)	جلیل قدوائی	۱۱۱
سرسیّد راس مسعود	سیّد عبدالعزیز	۱۱۳
علامہ اقبال اور سیّد راس مسعود	فقیر وحید الدین	۱۱۷
مسعود جنگ اور بابائے اُردو	رئیس احمد جعفری	۱۲۳
افغانستان میں مسعود کا خیر مقدم (نظم)	قاری عبداللہ خاں	۱۲۶
سرسیّد راس مسعود	جمیل نقوی	۱۲۷
ایک یادداشت	جلیل قدوائی	۱۴۹
مسعود جنگ	نواب سعید جنگ	۱۵۶
ایک دل نواز محسن	جلیل قدوائی	۱۶۳
مسعود کی بسم اللہ	تقریر سرسیّد احمد خان	۱۷۹

(انگریزی حصہ)

Contents

1.	This he said Sir Syed Ross Masood.	1
2.	None was nor will be like him E.M.Forster.	4
3.	Masood's concern was Muslims' future. Dr. F. Krunkow.	8
4.	My friend Masood The Rt. Hon. H.A.L. Fishe	10

5.	Masood's Outstanding Qualities.	
	A. Catter Morison.	12
6.	A leader of Men	
	R. R. Glancy.	14
7.	He was the Prince of a Mysterious Region.	
	E.E.Speight.	16
8.	His 'Karma' is with us	
	K.M. Pannikar.	22
9.	Ross Masood: An Appreciation	
	K.G. Saiyidain.	27
10.	In Abiding Memory of a Noble Soul	
	A. H. Abbasi.	35
11.	A Pre-Eminent Educationist.	
	S.F. Faridi.	38
12.	The Man that Sir Ross was	
	S.M. Shafi	49
13.	Ross Masood: Did he not die a Martyr?	
	M. Yakub Dadashi.	52

جیسا کہ فہرست مضامین کے ساتھ ساتھ اس کے لکھنے والوں سے بھی اس کے وقیع ہونے کا اندازہ ہوجاتا ہے کیوں کہ اس ''مجموعے کے مضمون نگار سب جانے پہچانے اور ہماری ادبی تاریخ کے معمار ہیں۔'' ۲۶۴

آغازِ کتاب میں ''گزارش'' کے عنوان سے جلیل قدوائی نے اس مجموعے میں شامل مضامین کے بارے میں یہ صراحت کی ہے کہ اس کے مضامین درج ذیل مآخذ سے منتخب کیے گئے ہیں:

۱۔ ۱۹۳۷ء میں راس مسعود کی وفات پر اخبار و رسائل میں شائع ہونے والے مضامین نظم و نثر۔

۲۔ انجمنِ ترقی اُردو (اورنگ آباد) کے سہ ماہی رسالے ''اُردو'' کا ''مسعود نمبر''۔

۳۔ ترقی اُردو بورڈ کراچی (اب اُردو ڈکشنری بورڈ کراچی) کا سہ ماہی رسالہ ''اُردو نامہ''۔

۴۔ راس مسعود سوسائٹی کراچی کے زیر اہتمام پہلا ''یوم راس مسعود'' منعقدہ ۳ رمئی ۱۹۶۴ء کے موقع پر شائع ہونے والی تحریریں نیز اس موقع پر چھپنے والے یادگاری مجلّہ ''یادگار مسعود'' کے مشمولات سے انتخاب۔ ۲۶۵ جلیل قدوائی نے اس مجموعے کے مشمولات پر بات کرتے ہوئے یہ صراحت کی ہے کہ اس میں ''صرف ایک مضمون نیا اور غیر مطبوعہ ہے جس کی شمولیت راقم کے لیے موجب

سعادت ہے''۔۲۶۶

جلیل قدوائی نے جس نئے اور غیر مطبوعہ مضمون کا ذکر کیا ہے وہ ''مسعود کی بسم اللہ'' پر سرسیّد کی تقریر ہے۔ جو اس وقت تک سرسیّد کے مضامین کے کسی مجموعے میں شامل نہیں تھی۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اس مجموعے سے راس مسعود کی ایک تاریخی تقریر کا طویل اقتباس نقل کرتے ہوئے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ آپ نے راس مسعود کے خالص مشرقی مزاج کے متعلق لکھا ہے کہ وہ مشرق و مغرب کی خوبیوں کا مجموعہ تھے، انھیں ''اپنی ثقافت، اپنی تہذیبی روایات اور اپنی زبان سے والہانہ عشق تھا۔ وہ اس باب میں کسی احساسِ کمتری کا شکار نہیں تھے۔''۲۶۷

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے راس مسعود کی جس تاریخی تقریر کا اقتباس نقل کرتے ہوئے اُس کی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے وہ ۱۹۳۲ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے سینٹ ہاؤس میں کی گئی تھی۔ آپ نے اس تقریر کی بابت لکھا ہے کہ: ''اس سے ان کے [راس مسعود کے] مزاج، اُن کی تعلیمی فلسفہ اور نقطۂ نظر کی پوری وضاحت ہوتی ہے۔''۲۶۸

اسی طرح شان الحق حقی نے اس مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے جہاں اس اکیڈمی کے قیام کو ''ایک مبارک اقدام''۲۶۹ سے تعبیر کیا ہے وہیں آپ نے اس اکیڈمی کے نام پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ ''راس مسعود جیسے اُردو دوست انسان کے نام پر جو ادارہ قائم کیا جائے ہم اس کا اتنا ثقیل انگریزی نام رکھنے کی داد نہیں دے سکتے۔''۲۷۰

شان الحق حقی اس یادگاری تالیف کی بابت اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

> ''کسی قوم کی عظیم تخلیقات میں سب سے پہلا درجہ عظیم کردار اور شخصیت کا ہے۔ ہم نے اپنی حالیہ تاریخ میں جو مثالی شخصیتیں پیدا کیں، ان میں راس مسعود بھی تھے، جن سے ملنے اور جنھیں دیکھنے کی وہ لوگ ہمیشہ حسرت کریں گے جو اُس سے محروم رہے، وہ کیا شخصیت تھی اور اس کے کیا کارنامے ہیں، اس کا اندازہ ان ۲۴ مضامین سے ہوتا ہے جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔''۲۷۱

الغرض ''مرقعِ مسعود'' کے جائزے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جلیل قدوائی نے راس مسعود کی شخصیت اور کارناموں کو اُجاگر کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ اس مجموعے کے تمام مضامین اہم ہیں۔ جنھیں نہایت سلیقے سے مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے۔ اس مجموعے کی علمی، ادبی اور ثقافتی حلقوں میں پذیرائی ہوئی۔ متعدد چوٹی کے لکھنے والوں نے اس پر تبصرے کیے۔ چناں چہ علمی و تحقیقی اعتبار سے بھی اس تالیف کا پایہ اطمینان بخش نظر آتا ہے۔

(۳:ب:iii) ''خیابانِ مسعود'' (اُردو۔انگریزی) ۲۷۲

یہ راس مسعود اکادمی کے سلسلۂ اشاعت کی پانچویں کڑی ہے۔اس یادگاری تالیف کے ذریعے بھی راس مسعود کی زندگی اور کارناموں پر مشاہیر کے اُردو اور انگریزی مضامین یکجا کیے گئے ہیں۔

۳۶۳ صفحات کا یہ ضخیم مجموعہ (۱۸۰ صفحات اُردو اور ۱۸۳ صفحات انگریزی) علمی، ادبی، تحقیقی اور ثقافتی نوعیت کے مسالے کا حامل ہے۔آگے بڑھنے سے قبل اس کے مشمولات پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ چناں چہ اس مجموعے کی فہرستِ مشمولات ملاحظہ ہو:

فہرست

گزارش ۷

دفتر اوّل: گُل ہائے عقیدت

ایک خواب اور اس کی تعبیر	علاّمہ اقبال	۱۱
مسعود کے حضور میں!	بابائے اُردو	۱۳
تہذیب و شرافت کا نادر نمونہ	سیّد ہاشمی فرید آبادی	۲۳
نواب مسعود جنگ	غلام یزدانی	۲۷
مسعود کی زندگی کے چند نامعلوم گوشے	ہارون خاں شروانی	۳۵
سیّد راس مسعود: شخصیت اور کارنامے	خواجہ غلام السیدین	۵۳
مسعود کی آفاقیت	خورشید الاسلام	۷۱
حیدرآباد میں سر راس مسعود کی تعلیمی خدمات	تحسین سروری	۷۷
مسعود کی چند جھلکیاں۔بھوپال میں	عنبر چغتائی	۸۹
ایک علم دوست رہنما، سر راس مسعود	آفتاب زبیری	۹۷
خانوادۂ سرسیّد کا گُلِ سرسبد	اُمید فاضلی	۱۰۱
در یادِ رفیق (نظم)	نواب سر نظامت جنگ	۱۰۹
بود از آلِ مصطفیٰ مسعود (نظم)	ضیا یار جنگ بہادر	۱۰۹
مسئلۂ یادگارِ مسعود	جلیلؔ قدوائی	۱۱۱
حوصلہ افزائیاں	ہارون خان شروانی	۱۱۷

عبدالمجید قریشی تا
خواجہ غلام السیدین ۱۲۰

دفتر دوم: فرموداتِ مسعود

روحِ جاپان ۱۲۳
طلوعِ آفتاب کی سرزمین ۱۲۵
یہ شہنشاہی اقلیم (جاپانی نظم) ۱۲۷
جلد تر اشاعت علم کے لیے دیسی زبان کا استعمال ۱۲۹
اپنی زبان میں تعلیم ۱۵۳
تدریس میں صداقت کی اہمیت ۱۶۹
مسعود افغانستان میں ۱۷۱
مکتوباتِ راس مسعود ۱۷۳

(انگریزی حصہ)

Contents

Book 1

(Appreciation)

1. A name to conjure with
Jalil Ahmed Kidwai 9
2. Masood's "Hereditary Duties"
Late Maulana Mohammad Ali. 15
3. "Noble Scion of anIllustrious House"
Prof. A.B.A. Haleem. 17
4. My last meeting with Ross Masood
Dr. Nazir Ahmed 29
5. Syed Ross Masood: A Memorable Personality
K. Sarwar Hasan. 35
6. Ross Masood: His stature and services
Mirza Ali Azhar. 41
7. Masood saved Aligarh.

K.J. Ahmed. 49
8. E.M.Forster and Syed Ross Masood
Jalil Ahmed Kidwai. 55
9. Karachi salutes Ross Masood. 59
10. "Ross Masood Day' Messages. 63

Book - II

(Masood's own contributions)

1. Muslim University: What shonld it be? 71
2. To the Health of "The Dear old College". 77
3. Glimpses from "Travels in Japan". 83
4. National Education: Bold experiment at
Osmania University. 103
5. How to save the great Muslim culture. 129
6. Mass Education Possible through
Mother Tongue Aione 143
7. His Ideals of service at Aligarh. 157
8. At the Feet of the Muse. 159
9. He wrote in "Letters of Gold". 165

جیسا کہ فہرست سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ تالیف بھی ذولسانی (اردو۔انگریزی) خصوصیت کی حامل ہے۔اس کے ہر دو حصّے مزید دو۔دو حصّوں میں منقسم ہیں۔ جو بالترتیب راس مسعود پر مشاہیر کی تحریروں کے ساتھ ساتھ خود موصوف کے فرمودات اور نگارشات پر مشتمل ہیں۔

اس تالیف میں سبھی تحریریں منتخب اور معیاری ہیں جو راس مسعود کی زندگی کے بعض نامعلوم گوشوں کی نقاب کشائی کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت اور کارناموں کو بھی مؤثر انداز سے سامنے لاتی ہیں۔اس مجموعے میں ''گزارش'' کے علاوہ جلیلؔ قدوائی کے تین مضامین شریک ہیں۔دو انگریزی اور ایک اُردو میں۔ نیز راس مسعود کے انگریزی خطوط کے تراجم اور حواشی علاحدہ ہیں۔''مسئلۂ یادگارِ مسعودؒ'' کے ذیل میں آپ کے مضمون کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں آپ نے راس مسعود کی خدمات کا اجمالی تعارف پیش کیا ہے۔ یہ مضمون دراصل آپ کی ایک تقریر کی تلخیص ہے جو اس مجموعے میں شریک ہونے سے قبل کتابچے کی صورت میں بھی چھپ چکی ہے۔۲۳؎

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ جلیلؔ قدوائی نے اس مضمون میں راس مسعود کی علمی وادبی خدمات

کا تذکرہ کرتے ہوئے فروغِ اُردو اور ادبیات کے حوالے سے اُن کی کوششوں کا ایک مجمل احوال پیش کیا ہے۔

اس تذکرے میں جلیل قدوائی نے بتایا ہے کہ راس مسعود نے سب سے پہلے اُردو مطبوعات کا مثالی معیار قائم کیا۔ اور اس سلسلے میں اُردو کے فخر روزگار شعرا و مصنفین کے شاندار ایڈیشن شائع کرائے۔ ۲۷۴ اُردو کے حوالے سے راس مسعود کی خدمات کے سلسلے میں جلیل قدوائی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ''اُن کے اپنے 'انتخابِ زرّیں' نیز میر، غالب، انیس کے کلام اور خطوطِ سرسیّد کے نظر افروز ایڈیشنوں سے پہلے اُردو کتابیں سڑے گلے بادامی کاغذ پر اور کم سواد طرزِ تحریر میں شائع ہوتی تھیں۔ ...نواب عماد الملک کی وفات کے بعد برسوں وہ کل ہند انجمن ترقی اُردو کے صدر رہے۔... اُنھوں نے گارساں دتاسی کے خطبات کا ترجمہ کیا اور نہ جانے کتنے لوگوں کو اُردو کی خدمت پر لگایا۔ بہ حیثیت ناظمِ تعلیمات، حیدر آباد میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک تعلیم عام کر دی''۔ ۲۷۵

شان الحق حقی نے اس مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے قابلِ قدر تالیف قرار دیا ہے ان کے نزدیک اسے ''مرقعِ مسعود'' کا دوسرا حصّہ کہنا چاہیے۔ ۲۷۶ انھوں نے راس مسعود کو مسلمان قوم کا ''ایک انمول سپوت'' کہتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ان کے علمی کارنامے بھلا دینے کے قابل نہیں۔ ان کی شخصیت و کردار کا نقش بھی زندہ و تابندہ رہنا چاہیے''۔ ۲۷۷

شان الحق حقی نے ''مرقعِ مسعود'' کے سلسلے میں اپنے پانچ برس قبل کے تبصرے کے ایک نکتے کو آگے بڑھاتے ہوئے ''خیابانِ مسعود'' کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ:

> ''ہماری روایتی اقدار میں سیرت کو علمیت پر بھی تقدم حاصل ہے، لیکن جہاں یہ دونوں یکجا ہو جائیں، وہاں انسان کی برگزیدگی کا کیا ٹھکانا، راس مسعود انسانیت کی ایسی ہی معراج پر تھے۔ ان کی شخصیت نے جن اجزا سے ترکیب پائی تھی ان میں سے ایک ایک [کذا] ایسی دل آویزی تھی کہ ہم انھیں اپنی قومی شخصیات کے نگار خانے میں ایک نقش مثالی کے طور پر پیش کر سکتے ہیں''۔ ۲۷۸

جیسا کہ واضح کیا گیا ہے کہ جلیل قدوائی نے ''خیابانِ مسعود'' کے نام سے پیش نظر مجموعے میں راس مسعود کی حیات و خدمات پر بیش قیمت تحریریں نہایت سلیقے سے یکجا کی ہیں۔ حسبِ ضرورت حواشی بھی تحریر کیے ہیں علاوہ ازیں آغازِ کتاب میں راس مسعود کی ایک یادگار تصویر بھی شائع کی ہے۔ علامہ اقبال نے راس مسعود کے انتقال پر جو تعزیتی ٹیلی گرام ان کے پس ماندگان کو بھیجا تھا اس کا عکس بھی شاملِ اشاعت ہے۔ اس مجموعے کا سرورق راس مسعود کی ایک نہایت باوقار شبیہہ سے مزّین کیا گیا ہے۔

بالغرض اس تالیف کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ اپنے مقاصد کی پوری طرح سے آئینہ دار ہے۔اس کے بلند پایہ علمی، تحقیقی اور تاثراتی مضامین کی ترتیب واشاعت سے جلیلؔ قدوائی کی تحقیقی وتنقیدی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ عمدہ پیش کش کا سلیقہ بھی سامنے آتا ہے۔

(۳:ب:iv)''شعلۂ مستعجل''(اردو۔انگریزی) ۲۷۹

پیشِ نظر مجموعہ بھی جلیلؔ قدوائی کا مرتبہ ہے۔ جو''راس مسعود اکادمی'' ہی کے یادگاری سلسلۂ اشاعت کی آٹھویں کڑی ہے اس کی ضخامت ۲۸۶ صفحات (۱۹۲۔اُردو اور ۹۴ رانگریزی) پر محیط ہے۔

اس کے مشمولات پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ہی اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ چناں چہ ذیل میں اس کے ہر دو حصوں کی فہرستِ مضامین پیش کی جاتی ہے، ملاحظہ ہو:

فہرست

	گزارش		۷
	راس مسعود سوسائٹی		۹
	شجرۂ عالی نسبی		۱۱
	مسعود کا سفرِ حیات		۱۲
	دفتر اوّل: خنک دلے تپید و دمے نیا سائید		
۱۔	مسعود سے توقعیں	سر سیّد احمد خاں	۲۱
۲۔	سیّد مسعود مسٹر ماریسن کی سپردگی میں	میر ولایت حسین	۲۲
۳۔	تاریخی رقعۂ شادی	محمود بیگم	۲۵
۴۔	راس مسعود۔ بیرسٹری سے تعلیم کی طرف	محمد حبیب اللہ رشدی	۲۶
۵۔	مسعود اور اُن کی تعلیمی خدمات	سیّد علی اکبر	۲۹
۶۔	فرمانِ نظام جنّت مقام	نواب میر عثمان علی خاں بہادر، آصف جاہ	۴۶
۷۔	گُل ہائے عقیدت (نظم)	شیخ عبدالحق	۴۸
۸۔	علامہ اقبال اور سیّد راس مسعود	جلیلؔ قدوائی	۵۰
۹۔	نواب مسعود کی دل نوازی	سیّد یوسف بخاری دہلوی	۶۹

۱۰۔ بچّوں کے راس مسعود (نظم) مائل نقوی ۸۳
۱۱۔ مسعود۔ مشاہیر مراسلت جلیلؔ قدوائی ۸۴
دفترِ دوم: گُلہائے رنگا رنگ و آبِ دادۂ رفتم
۱۲۔ سیّد راس مسعود کی وفات کا حادثہ نظامی بدایونی ۱۵۹
۱۳۔ دورانِ بقا گردشِ دوراں میں نہیں ہے (نظم)
ارشدؔ تھانوی ۱۶۳
۱۴۔ ایک یتیم کی بسم اللہ چوہدری خوشی محمد خان ناظر ۱۶۵
۱۵۔ نوائے تعزیت (نظم) فہمی بھوپالی ۱۶۹
۱۶۔ ناموں کے نشان سیّد راس مسعود ایک اداریہ ۱۷۱
۱۷۔ سر راس مسعود پر دو آنسو (نظم) ناصر اٹاوی ۱۷۸
۱۸۔ کوششِ ناتمام جلیلؔ قدوائی ۱۷۹
ضمیمہ: مقدمہ "بیاضِ سحر" (از سیّد راس مسعود)

(انگریزی حصہ)

Contents

Book one: ("Weeping Willows")

1. Masood as I knew Him.
Haroon Khan Sherwani (Padma Bhooshan).9
2. Syed Ross Masood
Hashim Mohammad Ali 23
3. Third Successive Great of a Family of Greats.
Jilal Ahmad Kidwai. 36
4. His Enviable Record
Maharaja of Bardwan 51
5. A Miscellany of Letters:
(i) On objectives of Aligarh.
Sir Theodore Morison. 54
(ii) "Nonsense to one Whom one Loves".
E.M.Forster. 58

	(iii) Of Abid, Spies and Pickthall.	
	Dr. F. Krenkow.	60
6.	His Spirit of Service and Sacrifice.	
	Khwaja Nazimuddin.	63
7.	How India Mourned Masood's Demise.	
	Jalil Ahmad Kidwai.	66
8.	His last Illness.	
	Col. M.A. Rahman.	72
	Book Two: ("Rubies of Badakhshan")	
1.	Some Aspects of Urdu Poetry.	76
2.	Comments of Dr. Mahmood's	
	Editon of Ghalib.	79
3.	Rules for Teachers and Taught.	81
4.	Impressions of a visit of Kabul.	86
5.	King Nadir's Legacy.	88
6.	Iqbal's Pension: Reminder to Agha Khan.	93

فہرستِ مشمولات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ مجموعہ راس مسعود کی زندگی اور کارناموں سے آگاہی کے لیے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں سرسیّد احمد خان سے لے کر جلیلؔ قدوائی تک مشاہیر علم وادب نے اپنے اپنے انداز سے راس مسعود کی شخصیت اور خدمات کو موضوع بنایا ہے۔

جیسا کہ فہرست سے معلوم ہوتا ہے اس میں جلیلؔ قدوائی کے تین اُردو اور دو انگریزی مضامین شریک ہیں۔ یوں تو تقریباً سبھی مضمون نگار جانے پہچانے اور تاریخی حیثیت کے حامل ہیں مگر اُردو میں سرسیّد احمد خان، مائل نقوی، نظامی بدایونی، سیّد یوسف بخاری دہلوی اور جلیلؔ قدوائی کی تحریریں کسی طرح بھی خاصے کی چیزوں سے کم نہیں۔ اسی طرح انگریزی حصّے کو دیکھیں تو اس میں ہارون خان شروانی (پدما بھوشن)، ہاشم محمد علی، اور جلیلؔ قدوائی کی تحریروں کے علاوہ سر تھیوڈور ماریسن، ای۔ایم۔فوسٹر اور ڈاکٹر ایف۔ رینو کے خطوط بھی نہایت قابلِ قدر پہلوؤں کو اُجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔

علاوہ ازیں پیشِ نظر مجموعے کا ایک حصّہ خود راس مسعود کی وقیع نگارشات وارشادات پر مشتمل ہے۔ یوں اس مجموعے کے مشمولات کئی لحاظ سے علمی، ادبی، تحقیقی، تعلیمی اور تاریخی اعتبار سے قابلِ قدر دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی مدد سے مستقبل کا سوانح نگار راس مسعود کی حیات وخدمات پر باآسانی کام کرسکتا ہے۔

جلیلؔ قدوائی نے راس مسعود کی زندگی، شخصیت اور کارناموں کے سلسلے میں متنوع پہلوؤں پر مستند تحریریں یکجا کر کے نہایت اہم علمی خدمت انجام دی ہے۔ اس مجموعے کی پیش کش میں سلیقے سے کام لیا گیا ہے۔ باوقار سرورق سے لے کر اغلاط نامے تک، تمام تحریروں میں حُسنِ ترتیب کا قابلِ ذکر مظاہرہ دکھائی دیتا ہے۔ چند نادر و نایاب تصاویر بھی شاملِ اشاعت ہیں۔ مرتب کے حواشی و تعلیقات، ''گزارش''، اور ضمیمہ کے باعث یہ مجموعہ اور بھی مفید ہو گیا ہے۔

آغازِ کتاب میں ''مسعود کا سفرِ حیات'' (ص ۱۲) سے بخوبی معلوم ہوتا ہے فاضل مرتب راس مسعود کی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ جلیلؔ قدوائی نے جس تلاش و تفتیش اور تحقیق و جستجو سے کام لیتے ہوئے راس مسعود کی حیات کے تمام قابلِ ذکر اُمور کو سنین وار مرتب کیا ہے وہ اپنے موضوع پر اُن کی دست رس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

''علامہ اقبال اور راس مسعود''، جلیلؔ قدوائی کا نہایت اہم مضمون ہے جو اقبالیات کے حوالے سے بھی قابلِ قدر ٹھہرتا ہے۔ چوں کہ آپ کو ہر دو شخصیات سے ذاتی واقفیت تھی لہٰذا مندرجہ بالا عنوان کے حوالے سے اپنے بعض مشاہدات کو بھی قلم بند کیا ہے۔ اس مضمون میں آپ نے ''خطوطِ اقبال'' کو بطورِ خاص ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ علاوہ ازیں وحیدالدین فقیر کی کتاب ''روزگارِ فقیر'' سے بھی کچھ حوالے پیش کیے ہیں۔

جلیلؔ قدوائی نے اپنے مضمون میں ایک قابلِ تحقیق نکتہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''راس مسعود، علامہ اقبال سے عمر میں بارہ برس چھوٹے تھے، مگر دونوں ایک ہی زمانے میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت میں مقیم تھے۔ بے شک مسعود علی گڑھ سے میٹرک کر کے اور علامہ لاہور سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد گئے تھے۔ نیز مسعود ولایت سے ۱۹۱۲ء میں واپس آئے مگر علامہ کے ۱۹۰۸ء میں ہندوستان واپس آنے تک عمر اور تعلیم کی سطح کی تفاوت کے باوجود دونوں ولایت میں ہم عصر تھے اور اس دوران ہر دو کی ملاقات اور دوستی کو خارج از امکان نہیں قرار دیا جا سکتا اس سلسلے میں تحقیق کی ضرورت ہے''۔ ۲۸۰

''شعلۂ مستعجل'' کی ایک اہم خصوصیت راس مسعود کی بعض مشاہیر سے نادر و نایاب مراسلت کی اشاعت ہے۔ ان میں نواب امداد امام اثرؔ، نواب نصیر حسین خیالؔ، خواجہ حسن نظامی، سیّد بے نظیر شاہ وارثی، بابائے اُردو مولوی عبدالحق، مولوی محمد امین زبیری، جوشؔ ملیح آبادی، ابوالاثر حفیظ جالندھری، عبدالرحمٰن چغتائی اور شیخ عطاء اللہ کے خطوط سے علم و ادب کے بعض اہم گوشے بھی سامنے آتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس مجموعے میں دو تاریخی تصاویر بھی شاملِ اشاعت ہیں۔ ان میں ایک تصویر تو راس مسعود کے بچپن کی ہے جس میں وہ

اپنے دادا سر سیّد احمد خاں کی گود میں بیٹھے ہیں اور اُن کے والد جسٹس سیّد محمود بھی اپنے ایک چچازاد کے ہمراہ تشریف فرما ہیں، جب کہ دوسری تصویر میں راس مسعود کا ای۔ ایم۔ فوسٹر اور دیگر احباب کے ساتھ گروپ فوٹو ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ اس مجموعے میں شامل بعض انگریزی مضامین اور خطوط بھی راس مسعود کے حوالے سے اہم معلومات کے حامل ہیں نیز خود موصوف کی تحریروں سے منتخب اقتباسات بھی اس تالیف کی قدر و قیمت میں اضافے کا باعث ہیں۔

جلیل قدوائی نے اپنے انگریزی مضمون "Third Succssive Great of a family of Greats" میں بھی راس مسعود کی شخصیت اور علی گڑھ کے حوالے سے ان کی خدمات پر محققانہ نظر ڈالی ہے اس سلسلے میں انھوں نے فیلڈ مارشل ایوب خان کی ''سیاسی خودنوشت'' "Friends Not Masters" میں درج راس مسعود کے حوالے سے بعض غلط معلومات کا تنقیدی اور تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے اصل صورتِ حال پیش کر دی ہے۔ جلیل قدوائی نے ایوب خان کا یکم نومبر ۱۹۳۵ء کا ایک (انگریزی) خط اور راس مسعود کا جواب بھی اپنے مضمون میں شائع کر کے یہ دکھایا ہے کہ خود ایوب خان اس زمانے میں راس مسعود سے کس قدر نیازمندانہ انداز سے اپنے بھائی کی ملازمت کے سلسلے میں سفارش کے خواہاں تھے۔ چوں کہ راس مسعود کے حلقۂ اثر میں بڑے بڑے انگریز آفیسرز بھی تھے، نیز وائسرائے سے وہ مساویانہ طریقے پر ملا کرتے اور گفتگو کیا کرتے تھے۔ لہٰذا ایوب خان کا یہ لکھنا کہ انھوں نے علی گڑھ کے لیے نظام سے راس مسعود کو امداد دلوائی تھی، حقیقت سے بعید ہے۔ جلیل قدوائی نے نظام حیدر آباد دکن سے راس مسعود کے روابط کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ ان کی بات کو کس قدر اہمیت دیتے تھے۔

جلیل قدوائی نے ایوب خان کی مذکورہ کتاب کے اقتباسات اور ان کے خط نیز راس مسعود کے جواب کا پورا متن درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

> "I quote it in full, as a masterpiece of the art of self interested letter writing. Readers will mark the difference between the tone of the statement quoted from his book and that of the letter and draw their own conclusion. I also quote Masood's reply to show the 'depth' of friend liness between the two, ... As stated above, Masood was thus in no need of Ayub's help in Hyderabad."[۲۸]

''شعلۂ مستعجل'' کی اشاعت پر تبصروں اور خطوط کے ذریعے جو اظہارِ خیال کیا گیا ہے ذیل میں ان کا بھی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ ماہنامہ ''فاران'' کراچی میں ''شعلۂ مستعجل'' پر شائع ہونے والے ایک مفصل تبصرے سے مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے اس تالیف اور اس کے فاضل مرتب جلیل قدوائی کی کاوشوں کے بارے میں مبصر ''فاران'' کے نقطۂ نظر سے آگاہی ہوتی ہے۔ مذکورہ تبصرے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''محترم جلیل قدوائی ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنی تصنیف 'شعلۂ مستعجل' کے آئینے میں علی گڑھ کی ایسی تصویر دکھادی ہے جس سے پاکستانی قوم یا تو واقف ہی نہیں ہے یا اسے بھولتی جارہی ہے۔ سر راس مسعود کی اصل شخصیت کو انھوں نے جس پُر اثر انداز میں پیش کیا ہے اس سے کسی کو یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی کہ وہ مسلمانوں کے روشن خیال طبقے کے اس وقت بھی آئیڈل (Ideal) تھے اور اب بھی ہو سکتے ہیں۔''۲۸۲

جناب مشفق خواجہ نے ''شعلۂ مستعجل'' کی تقریبِ رونمائی منعقدہ ۲۷ مئی ۱۹۸۳ء ۲۸۳ کے موقع پر جو خطبہ دیا تھا اس میں ''راس مسعود سوسائٹی'' کے حوالے سے جلیل قدوائی کی علمی، تحقیقی اور تہذیبی خدمات کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ''شعلۂ مستعجل'' کو ان کا ایک کارنامہ قرار دیا ہے۔

جناب مشفق خواجہ نے راس مسعود کی پہلو دار شخصیت اور ان کے تاریخی کارناموں پر اجمالاً روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''یہ کتاب ایک اہم علمی و ادبی دستاویز ہے جس کی تصدیق کئی حوالوں سے ہوتی ہے سب سے اہم حوالہ تو خود راس مسعود کی ذات ہے۔ اُن کے کاموں کا تذکرہ ایک عہد کی بازیافت کا درجہ رکھتا ہے۔ کیوں کہ راس مسعود اپنے عہد کی شناخت تھے۔''۲۸۴

بقول مشفق خواجہ تمام اہم شخصیات سے اُن کے ذاتی تعلقات تھے اور وہ ان کی بہتری کے لیے سرگرم رہا کرتے تھے۔ وہ ''شاعرِ مشرق ہوں، یا مصورِ مشرق چغتائی، مشرق سے اُبھرنے والی ان روشنیوں میں راس مسعود کے خلوص کی روشنی بھی شامل تھی''۔۲۸۵

مشفق خواجہ نے نہایت جامع انداز سے زیرِ نظر مجموعے پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ انھوں نے اس کے مشمولات کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ:

> ''...'شعلۂ مستعجل' میں راس مسعود کی پہلو دار شخصیت کے کئی رنگ نظر آتے ہیں۔ اس کتاب کا سب سے اہم حصہ وہ خطوط ہیں جو مختلف مشاہیر نے راس مسعود کے نام لکھے تھے۔ ان سے مکتوب نگاروں کے ساتھ ساتھ مکتوب الیہ کے بارے میں بھی بہت سے [کذا۔ سی] نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ آج سے ۳۵۔۳۶ سال پہلے جب راس مسعود کے نام علامہ اقبال کے خط شائع ہوئے تھے تو

پہلی مرتبہ ان دونوں کے تعلقات کی صحیح نوعیت معلوم ہوئی تھی اور اب 'شعلۂ مستعجل' کی اشاعت سے ہمارے دو اور بڑے شاعر جوشؔ اور حفیظؔ اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ ہمارے سامنے آئے ہیں۔''۲۸۶

اسی طرح مختار مسعود نے ''شعلۂ مستعجل'' کے مطالعے کے بعد جلیلؔ قدوائی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا کہ: ''ایک خود فراموش قوم میں وہ افراد بہت اہم ہوتے ہیں جو اس کی شناخت کے لیے مواقع اور مواد فراہم کرتے ہیں۔ آپ کا شمار اسی زمرہ میں ہے''۔۲۸۷

الغرض ''شعلۂ مستعجل'' اور اس کے فاضل مرتب کے بارے میں مشاہیر کی تحریروں سے جو منتخب اقتباسات پیش کیے گئے ہیں وہ حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔

چناں چہ زیرِ نظر مجموعے کے بارے میں حاصلِ مطالعہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جلیلؔ قدوائی کی مرتبہ اس علمی اور تحقیقی کاوش سے جہاں راس مسعود کے بارے میں مستند اور تحقیقی مسالا یکجا ہوگیا ہے وہیں اس کے مرتب کے سلیقے کی بھی داد دینا پڑتی ہے۔ اس ضمن میں مشاہیر کی رائیں پہلے ہی پیش کی جاچکی ہیں۔

(۳:ب:v) ''اوراقِ گُل''۲۸۸

پیشِ نظر مجموعۂ مضامین ''اوراقِ گُل'' بھی جلیلؔ قدوائی کا مرتبہ ہے جو حسبِ سابق راس مسعود کی حیات و خدمات کے حوالے سے مزید نئی معلومات کا حامل ہے۔ یہ راس مسعود اکادمی کے سلسلۂ اشاعت کی تیرہویں کڑی ہے۔ اس میں مرتب کی ''گزارش'' سمیت کُل چھوٹی بڑی آٹھ تحریریں یکجا کی گئیں ہیں، اس کی ضخامت ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں شامل تحریریں اور ان کے لکھنے والوں کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

ترتیب

۱۔	گزارش	مرتب	۶
۲۔	ایک ''پہلودار شخصیت''	مشفق خواجہ	۹
۳۔	''زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اُس کی''	محمد احمد سبزواری	۱۳
۴۔	سر راس مسعود کی فراست	''اخبارِ اُردو''	۳۲
۵۔	سر سیّد ثانی بھوپال میں	ایک انٹرویو	۳۳
۶۔	نگارشاتِ غیر فانی (خطوط)	مختلف حضرات	۳۹
۷۔	سر راس مسعود اور علی گڑھ میں اُردو کی تعلیم	جلیلؔ قدوائی	۱۲۰
۸۔	مادری زبان میں تدریس	سیّد راس مسعود	۱۲۵

جیسا کہ فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے مشمولات کس قدر متنوع اور اہم موضوعات کے حامل ہیں۔ مشفق خواجہ کی تحریر جو دراصل گزشتہ مجموعے ''شعلۂ مستعجل'' کی تقریبِ رونمائی کے موقع پر پیش کی گئی تھی نہایت قابلِ قدر ہے۔ اس تحریر کے ذریعے راس مسعود اور سوسائٹی ہٰذا کے حوالے سے جلیل قدوائی کی خدمات کو بھی سراہا گیا ہے۔ یہ تحریر محض مروّت کے تحت نہیں لکھی گئی ہے بلکہ یہ نہایت خلوص اور حقیقتِ حال کی آئینہ دار ہے۔ جناب مشفق خواجہ نے راس مسعود کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے سچ لکھا ہے کہ: ''ہماری تہذیبی و تعلیمی زندگی پر راس مسعود کے بڑے گہرے اثرات ہیں۔''۲۸۹ آپ نے راس مسعود کی قومی و ملّی خدمات کے منور گوشوں کو سامنے لاتے ہوئے بتایا ہے کہ: ''مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت اور اس طرح اُنھیں آبرومندانہ زندگی کا راستہ دکھانا، اُردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا، اُردو ادب اور زبان کو باثروت بنانے کی کوششیں کرنا، نیز اسلامی ثقافت کو فروغ دینا۔''۲۹۰ آپ کی ایسی خدمات ہیں جنھیں بھلایا نہیں جا سکتا اور ان شعبوں میں آج جو ترقی نظر آتی ہے اس کا سہرا راس مسعود ہی کے سر جاتا ہے۔ لیکن یہ علاحدہ بات ہے کہ ''ہم نے ان خدمات کا صلہ یہ دیا کہ راس مسعود کو بھلا دیا''۔۲۹۱

اسی بیان سے متصل جلیل قدوائی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے جناب مشفق خواجہ رقم طراز ہیں:

> ''...لیکن خدا بھلا کرے جناب جلیل قدوائی کا، کہ اُن سے یہ بے انصافی نہ دیکھی گئی اور اُنھوں نے راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی قائم کر کے ایک طرف تو راس مسعود کو فراموش کر دینے کی غلطی کی تلافی کی اور دوسری طرف تعلیمی، ادبی اور علمی محاذ پر گراں قدر کارنامے انجام دیے''۔۲۹۲

جناب محمد احمد سبزواری بھی ایسے مشاہیر ادب میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے راس مسعود کو قریب سے دیکھا اور جانا۔ آپ نے اس مضمون میں راس مسعود کے حوالے سے اپنی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے پہلی ملاقات سے لے کر ان کی وفات تک کا احوال بڑے مؤثر انداز سے بیان کیا ہے۔ چناں چہ اس ضمن میں آپ نے تفصیل سے لکھا ہے کہ ''ریاض منزل'' بھوپال میں علامہ اقبال کی موجودی میں انھیں کس طرح پہلے پہل راس مسعود سے نیاز حاصل ہوا تھا۔ اس کے بعد کی روداد بھی اس مقالے میں جستہ جستہ بیان ہوئی ہے۔ آپ نے اس مضمون میں راس مسعود کی محفلوں کے کئی دل چسپ اور چشم دید واقعات بیان کیے ہیں۔ مثلاً ایک مقام پر آپ نے لکھا ہے کہ راس مسعود اپنی والدہ سے بہت محبت کرتے تھے اور کسی نہ کسی طرح گفتگو میں ان کا ذکر لے آتے تھے۔ انھوں نے راس مسعود کے حوالے سے درج ذیل واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''[راس مسعود نے] ایک دن فرمایا کہ جب میں تازہ تازہ ولایت سے لوٹا تو اپنے ایک خاندانی

دوست کو خط لکھا اور اس میں دو ایک جگہ انگریزی جملے بھی لکھ دیے۔ جب یہ خط والدہ کو سنایا تو انھوں نے کہا: 'اُردو کے خط میں انگریزی کیوں لکھی؟ میں نے کہا: 'اماں یہ بات اُردو میں سمجھانا مشکل تھی'۔ اس پر انھوں نے فرمایا: 'مسعود کتنے شرم کی بات ہے کہ تم ایک غیر زبان پر قادر ہو مگر اپنی مادری زبان میں اپنے دل کی بات بیان نہیں کر سکتے'۔ وہ کہتے ہیں کہ میں واقعی شرم سے پانی پانی ہو گیا اور اس دن سے عہد کر لیا کہ حتی الامکان اُردو تحریر میں انگریزی استعمال نہیں کروں گا۔''۲۹۳

اسی طرح کے کئی اہم واقعات کے بیان سے سر راس مسعود کی شخصیت کے بعض پوشیدہ گوشوں کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس مجموعے کی ایک اہم تحریر ''سر سیّد ثانی بھوپال میں'' ہے، جو دراصل ڈاکٹر اخلاق اثر اور ممنون حسن خان کی گفتگو پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر اخلاق کے متعدد اہم سوالات کے ذریعے ممنون حسن خان نے راس مسعود اور علامہ اقبال کے تعلقات پر مفید گفتگو کی ہے۔ یاد رہے کہ ممنون حسن خان ہر دو شخصیات کے نہایت قریب تھے بلکہ بھوپال میں آپ علامہ اقبال کے معتمد خاص ہوا کرتے تھے۔ اور یہ قرب آپ کو راس مسعود ہی کی بدولت میسّر ہوا تھا۔ آپ نے اقبال اور راس مسعود کی مجلس کا احوال سناتے ہوئے فن اور زندگی کے تعلق پر اقبال کا ارشاد نقل کیا ہے۔ پہلے راس مسعود کا سوال اور پھر علامہ اقبال کا جواب ملاحظہ ہو:

''فن کیا ہونا چاہیے اقبال: (صرف راس مسعود تھے جو ان کو اقبال کہتے تھے) انھوں نے کہا: 'اسرارِ خودی اور زبورِ عجم پڑھ لو۔ فن کو زندگی اور شخصیت دونوں کا تابع ہونا چاہیے۔ پھر فرمایا: 'حیات اور شخصیت، اور اس پر زور دیا۔۔۔''۔۲۹۴

اسی طرح زیرِ نظر مجموعے میں ''نگارشات غیر فانی'' کے عنوان سے مشاہیر اور راس مسعود کی جو مراسلت شائع کی گئی ہیں وہ خاصے کی چیز کہی جا سکتی ہے۔ چناں چہ ان خطوط کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

۱۔	راس مسعود بہ نام علامہ اقبال	چھ (۶) خط
۲۔	راس مسعود بہ نام عبدالرحمٰن چغتائی	گیارہ (۱۱)
۳۔	راس مسعود بہ نام نواب زادہ سعید الظفر خان	ایک (۱)
۴۔	راس مسعود بہ نام محمد امین زبیری	چھ (۶)
۵۔	محمد امین زبیری بہ نام راس مسعود	آٹھ (۸)
۶۔	ڈاکٹر ذاکر حسین خان بہ نام بیگم چھتاری	ایک (۱)
۷۔	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد بہ نام سیّد راس مسعود	ایک (۱)
۸۔	سیّد راس مسعود بہ نام ڈاکٹر ضیاء الدین احمد	ایک (۱)

۹۔	شاہ محمود خان (کابل) بہ نام سیّد راس مسعود	ایک (۱)
۱۰۔	شاہ ولی خان (پیرس) بہ نام سیّد راس مسعود	ایک (۱)
۱۱۔	وزارتِ دربار افغانستان بہ نام سیّد راس مسعود	ایک (۱)
۱۲۔	مولانا محمد عبدالحامد بدایونی بہ نام راس مسعود	دو (۲)
۱۳۔	راس مسعود بہ نام مولانا محمد عبدالحامد بدایونی	ایک (۱)
۱۴۔	مولوی عبدالباری ندوی بہ نام راس مسعود	ایک (۱)
۱۵۔	راس مسعود بہ نام مولوی عبدالباری ندوی	ایک (۱)
۱۶۔	مولانا مناظر احسن گیلانی بہ نام راس مسعود	دو (۲)
۱۷۔	کپتان (بعدہٗ فیلڈ مارشل) محمد ایوب خان بہ نام راس مسعود	ایک (۱)
۱۸۔	راس مسعود بہ نام محمد ایوب خان	ایک (۱)
۱۹۔	بیگم چھتاری (سابق لیڈی مسعود) بہ نام جلیلؔ قدوائی	ایک (۱)

یہ خطوط نہایت اہمیّت کے حامل ہیں ان میں سے بعض انگریزی خطوط کا اُردو ترجمہ جلیلؔ قدوائی نے کیا ہے۔ نیز ان پر آپ کے قیمتی حواشی نے ان کی افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ چناں چہ اس مراسلت کے ذریعے بھی راس مسعود کی زندگی اور کارناموں پر روشنی پڑتی ہے۔ ''اوراقِ گُل'' میں جن خطوط کا اُردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے اُن میں سے اکثر انگریزی خطوط کا متن ''شعلۂ مستعجل'' میں شائع ہو چکا ہے مثلاً محمد ایوب خان کا خط اور راس مسعود کا انگریزی جواب مذکورہ مجموعے میں شائع ہو چکا ہے۔ اسی طرح راس مسعود اور دیگر مشاہیر کے بعض انگریزی خطوط ''ڈان'' کراچی میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

چوں کہ ''راس مسعود سوسائٹی'' کے وسائل نہایت محدود تھے اسی لیے جلیلؔ قدوائی چاہتے ہوئے بھی مترجمہ خطوط کا اصل متن شائع نہ کر سکے۔ لیکن یہ ان کے آئندہ پروگرام میں شامل تھا۔ کہ تمام خطوط کو ''بہ نام مسعود'' کے تحت ایک مجموعے میں یکجا کر دیں۔ یہ تجویز جناب مشفق خواجہ نے پیش کی تھی جسے جلیلؔ قدوائی نے بھی پسند کیا تھا۔ زیرِ نظر مجموعے میں مشفق خواجہ اور جلیلؔ قدوائی کی تحریروں سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے۔[۲۹۵]

اب آخر میں ''اوراقِ گُل'' کی بابت مولوی ثناء الحق صدیقی (علیگ) اور ڈاکٹر مختار الدین احمد (علی گڑھ) کی رائیں پیش کی جاتی ہیں۔ چناں چہ پہلے مولوی ثناء الحق صدیقی (علیگ) کے تبصرے سے ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ کتاب نواب مسعود جنگ ڈاکٹر سیّد راس مسعود مرحوم کے متعلق مقالات اور اُن کے فرمودات کا مجموعہ ہے۔ اس [میں] آٹھ مضامین و مقالات شامل ہیں جو اُردو کے بعض صفِ اوّل کے ادیبوں نے تحریر کیے ہیں۔ اور تمام مضامین مواد اور زبان و بیان کے اعتبار سے نہایت وقیع ہیں۔ ان کو 'اوراقِ گُل' کہنا نہایت موزوں اور مناسب ہے۔ محترم قدوائی صاحب نے ان پتیوں کو یکجا کر کے کتاب ہٰذا کی شکل میں یہ تر و تازہ پھول تیار کیا ہے۔ جس کے لیے وہ قوم کی جانب سے تحسین و تبریک کے مستحق ہیں''۔ ۲۹۶

اب ڈاکٹر مختار الدین احمد کے مکتوب سے ایک مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو انھوں نے ''اوراقِ گُل'' کی رسید دیتے ہوئے جلیل قدوائی کو لکھا تھا۔ آپ رقم طراز ہیں کہ:

''۰۰۰'اوراقِ گُل' میں پہلے تو مشفق خواجہ صاحب کے لکھے ہوئے مقدمے پر نظر پڑی۔ بہت اچھا مقدمہ لکھا ہے کہ صرف اس کو پڑھ کر پوری کتاب کا نقشہ سامنے آجاتا ہے وہ واقعی آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ راس مسعود مرحوم پر سارے مضامین مفید اور معلومات افزاء ہیں۔ آپ نے مادری زبان میں تدریس والا انٹرویو خوب ڈھونڈ کر نکالا۔ ۲۹۷ انگریزی اور اُردو میں اسے دیکھ چکا تھا۔ اچھا ہوا آپ نے اس مجموعے میں بھی شریکِ اشاعت کر لیا۔'' ۲۹۸

الغرض ''اوراقِ گُل'' کے جائزے اور تبصروں کی روشنی میں جو نتیجہ سامنے آتا ہے اسے درج ذیل نکات میں بیان کیا جاتا ہے:

☆ راس مسعود کی حیات و خدمات نیز ان کی متنوع شخصیت پر نہایت قابلِ قدر مضامین ''اوراقِ گُل'' میں یکجا کیے گئے ہیں۔

☆ اکثر مضمون نگار ثقہ حیثیت کے مالک ہیں۔

☆ علمی، تحقیقی اور تاریخی اعتبار سے اس مجموعے کا مسالا دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

☆ اس مجموعے کی ترتیب و اشاعت میں سلیقے اور مہارت سے کام لیا گیا ہے۔

☆ اگرچہ یہ اخباری کاغذ اور پیپر بیک ایڈیشن ہے مگر بیش قیمت مواد پر مشتمل ہے۔

☆ اس مجموعے کی ترتیب و پیش کش میں جلیل قدوائی ایک ذمہ دار محقق اور مرتب نظر آتے ہیں۔

(۳:ج) ''سرسیّد علیہ الرحمہ مع ضمیمہ سیّد محمود'' (اُردو۔انگریزی) ۲۹۹

یوں تو پیشِ نظر مجموعے کے عنوان ہی سے اس کے موضوع کا اندازہ ہو جاتا ہے مگر پھر بھی یہ بتانا

ضروری ہے کہ اس میں جلیلؔ قدوائی نے راس مسعود کے والد جسٹس سیّد محمود اور دادا سرسیّد احمد خان، ہر دو کی شخصیت اور کارناموں پر اکابر و مشاہیر کی اُردو اور انگریزی تحریروں کو یکجا کر دیا ہے۔ خود مرتب جلیلؔ قدوائی کی چیزیں بھی اس مجموعے میں شریک ہیں۔ اس مجموعے کی ضخامت ۳۱۲ (اُردو ۲۲۴ اور انگریزی ۸۸) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کے جائزے سے قبل اس کے اُردو اور انگریزی مضامین کی فہرست پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ چناں چہ پہلے اُردو اور پھر انگریزی حصّے کی فہرست مضامین ملاحظہ ہو:

فہرست

	گزارش		۷
	راس مسعود سوسائٹی		۹
(الف) نذرِ سرسیّد			
۱۔	قولِ فیصل	ڈپٹی نذیر احمد	۱۴
۲۔	صبحِ اُمید	علامہ شبلی نعمانی	۱۵
۳۔	متفرقات:	مولانا احسن مارہروی	۱۸
۴۔	''ہجومِ غم واندوہ''	مولانا حالیؔ	۱۹
۵۔	حرفِ آخر	حضرت اکبرالہٰ آبادی	۲۲
۶۔	سیّد کی لوحِ تربت	علامہ اقبال	۲۲
۷۔	مرثیہ سرسیّد علیہ الرحمہ	چودھری خوشی محمد خاں ناظرؔ	۲۵
۸۔	متفرقات:	پروفیسر شہبازؔ	۳۱
(ب): سرسیّد و متعلقات			
۹۔	مدرسۃ العلوم	مولانا حالیؔ	۳۵
۱۰۔	سیّد احمد خاں	بابائے اُردو	۳۸
۱۱۔	سرسیّد، علی گڑھ اور مسلم قومیت	چودھری خلیق الزماں	۶۲
۱۲۔	دو قومی نظریہ کا بانی	بیگم ممتاز معین الحق	۷۴
۱۳۔	اسلام کا زندۂ جاوید مجاہد	الحاج محمد زبیر	۷۷
۱۴۔	سرسیّد ایک نظر میں	الحاج محمد زبیر	۹۳

۱۵۔	سرسیّد ہاؤس	جلیلؔ قدوائی	۹۶
۱۶۔	علی گڑھ کی یاد	شرف الدین احمد عظیم آبادی	۱۱۰
۱۷۔	حواشی	جلیلؔ قدوائی	۱۳۰
۱۸۔	قیامِ پاکستان میں علی گڑھ کا حصّہ	انصارؔ زاہد خاں	۱۵۱
۱۹۔	سیّد صاحب کی زندہ دلی	جلیلؔ قدوائی	۱۵۵
(ج)	فرمودات سیّد:		
۲۰۔	نعتِ رسول ﷺ		۱۶۰
۲۱۔	مسعود کی رسم بسم اللہ		۱۶۱
۲۲۔	ہبہ نامہ بہ نام راس مسعود		۱۶۷
۲۳۔	تجویز تقرر مدرسۂ فارسی		۱۶۹
۲۴۔	مسلمانانِ مرادآباد کی دعا	[بہ تمہید جلیلؔ قدوائی]	۱۷۴
۲۵۔	ایک نادر مراسلہ	مشفق خواجہ	۱۸۵
(د)	ضمیمہ: سیّد مسعود		
۲۶۔	چند جھلکیاں	میر ولایت	۲۰۱
۲۷۔	پودنوں میں دیو	بابائے اُردو	۲۰۵
۲۸۔	سیّد و جانشین سیّد	مولوی عبدالغنی	۲۱۴
۲۹۔	جسٹس سیّد محمود	عبدالمجید قریشی	۲۱۷

Contents

1. Preface
   Syed Saeed Jafri M.Sc (Alig).
2. Sir Syed's Legacy.
   Syed Shahid Hamid Maj. Gen. (Rtd).
3. He Paveed the way.
   Jamiluddin Ahmad.
4. Key Figure in Premation of Pakistan.
   Lawrence Ziring.
5. Sir Syed's campaign against congress.

Yahia M. Syed

6. His letter to Patiales.
   Jalil Ahmad Kidwai.
7. A reprehensible lia Nailed.
   Jalil Ahmad Kidwai.

(Appendix: Syed Mahmood)

8. A Forgotton Hero of our struggle.
   Jalil Ahmad Kidwai.
9. India's Homage to Justice Mahmood.
   (Stateman)

اس مجموعے کے اُردو انگریزی مشمولات پر ایک نظر ڈالنے سے بخوبی یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جلیل قدوائی نے سرسیّد احمد خاں اور ان کے فاضل فرزند جسٹس سیّد محمود کی شخصیت اور خدمات پر موجود منتشر تحریروں کو یکجا کیا ہے۔ ان مضامین کی اُردو کے سوانحی ادب میں یقیناً بہت اہمیت ہے۔ اسی طرح انگریزی تحریریں بھی تاریخی و دستاویزی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان تحریروں کی وساطت سے جہاں جنوبی ایشیا کی دو اہم ترین مسلم رہنما شخصیتوں کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے وہیں ان کے کارناموں سے آنے والی نسلوں کی آگاہی کا سامان بھی فراہم ہوگیا ہے۔

جلیل قدوائی کو علی گڑھ تحریک اور اس کے بانی مبانی سرسیّد احمد خان نیز ان کے بیٹے اور پوتے سے ایک خاص لگاؤ اور شغف رہا ہے اسی دل چسپی اور پرخلوص لگن کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے ۱۹۶۳ء میں ''راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی آف پاکستان'' قائم کی تھی۔ چناں چہ اس کے مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس یادگاری تالیف کی پیش کش میں جلیل قدوائی نے جس تلاش و جستجو اور سلیقے سے کام لیا ہے نیز حسبِ ضرورت مقامات پر حواشی تحریر کیے ہیں وہ نہ صرف لائقِ تحسین ہے بلکہ یہ کاوش ان کی عالمانہ تحقیق و تدوین کی مظہر بھی ہے۔

زیرِ نظر مجموعے میں شریک جلیل قدوائی کی تحریروں میں ''سرسیّد ہاؤس'' ۳۰۰ کے عنوان سے شریک مضمون بھی اہم ہے علاوہ ازیں آپ نے سرسیّد احمد خان کی ایک تحریر ''مسلمانانِ مرادآباد کی دعا'' ۳۰۱ کا متن اپنے طویل ابتدائی نوٹ کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس مجموعے میں سہ ماہی ''اُردو'' کراچی کی اشاعت سے بھی ''سرسیّد احمد خان'' کا ایک مکتوب نقل کیا گیا ہے۔ جسے مذکورہ رسالے میں ''ایک نادر مراسلہ'' کے عنوان سے جناب مشفق خواجہ نے پیش کیا تھا۔

انگریزی حصے میں بھی سب سے پہلے تو راس مسعود سوسائٹی کے صدر سیّد سعید جعفری کا طویل "Preface" ۳۰۲ ہے جو سرسیّد احمد خان کی شخصیت اور کارناموں کو بڑے جامع انداز سے سامنے لاتا ہے۔

جلیل قدوائی کی دو تحریریں تو سرسیّد کے حوالے سے شریکِ تالیف ہیں جب کہ ایک تحریر جسٹس محمود کی خدمات کو اُجاگر کرتی ہے۔

الغرض یہ ایک کام یاب اور معتبر یادگاری تالیف کہے جانے کے لائق ہے جس میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے قومی رہنماؤں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے ساتھ ساتھ نسلِ نو کی آگاہی کے لیے ان کی بے مثال جدوجہد بشمول ان کے علمی و ادبی اور قومی کارناموں پر نہایت جامع انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

بلاشبہ یہ تالیف اپنی قدر و قیمت نیز پیش کش کے لحاظ سے جلیل قدوائی کی علمی، ادبی، قومی اور تہذیبی خدمات کے شعبوں میں ایک باوقار اضافہ قرار دی جاسکتی ہے۔

ماحصل بہ سلسلہ راس مسعود:

راس مسعود، سرسیّد احمد خان اور جسٹس سیّد محمود کی زندگی، شخصیت اور کارناموں کے حوالے سے جلیل قدوائی نے جو یادگاری کتابیں مرتب کی ہیں۔ ان کے بارے میں مجموعی لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ نہایت بلند پایہ، علمی، ادبی اور تحقیقی نوعیت کے حامل مضامین کے مجموعے ہیں۔ ان کے مطالعے سے راس مسعود اور ان کی اجداد کے کارناموں کی تفصیلات ہی سے نئی نسل روشناس نہیں ہوتی بلکہ ان کی سیرت و کردار سے بھی بخوبی آگاہی ہوتی ہے۔ شان الحق حقی کے بقول ''ہماری روایتی اقدار میں سیرت کو علمیت پر بھی تقدم حاصل ہے'' ۳۰۳۔ لیکن ان بزرگوں کے یہاں تو سیرت و کردار کے ساتھ ساتھ علمیت بھی یکجا نظر آتی ہے۔ چناں چہ قومی زندگی کی بہتری اور نسلِ نو کی کردار سازی کے لیے ان کتابوں کی جو اہمیت سامنے آتی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔

ان مضامین کے اکثر لکھنے والوں کا پایہ مسلمہ ہے۔ ان میں بعض تو اکابرین میں شمار ہوتے ہیں اور اکثر مشاہیر میں سے ہیں۔

''مرقع مسعود'' کی بابت جس رائے کا اظہار ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے کیا ہے وہ درحقیقت ان تمام مجموعوں پر صادق آتی ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث رقم طراز ہیں کہ:

> ''[ان میں] مشرق و مغرب کے عالموں، علمی اور تہذیبی مجلسوں کے صدر نشینوں، راس مسعود کے دوستوں، عاشقوں اور نیازمندوں نے اُن کے بارے میں اپنے خیالات رقم کیے ہیں، یہ جھوٹی مدح

سرائی نہیں، نہ کسی گروہی مدح خوانوں کے جذبات ہیں۔"۳۴ ؎

ان کتابوں میں راس مسعود کی زندگی، شخصیت اور خدمات کے حوالے سے اتنا مسالا یکجا ہوگیا ہے جو بلاشبہ کہیں اور دست یاب نہیں ہوسکتا۔ راس مسعود کی سوانح حیات، جواب تک کماحقہٗ طور سے نہیں لکھی جاسکی ہے، جلیل قدوائی کی مرتبہ ان کتابوں کی مدد سے یقیناً لکھی جاسکے گی۔ یوں سوانحی ادب اور تحقیق کے میدان میں یہ جلیلؔ قدوائی کی خالص علمی اور سنجیدہ کاوشیں ہیں جن کا اعتراف علمی اور قومی ہر دو سطح پر کیے جانے کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں ان کتابوں کے تحقیقی جائزے سے یہ نتیجہ بھی سامنے آتا ہے کہ جلیلؔ قدوائی بحیثیت محقق و مرتّب تاریخِ ادب میں اہم اور قابلِ ذکر مقام دیے جانے کے لائق ہیں۔

(حصہ چہارم) انجمن کی ڈکشنریوں پر نظرِ ثانی واضافے اور اشاعت کا کام:

نوٹ: جلیل قدوائی کا انجمن کی ڈکشنریوں پر نظرِ ثانی واضافے اور اشاعت کا کام ایک علاحدہ مقالے کی صورت میں "خیابان" پشاور میں شائع ہوچکا ہے۔ چناں چہ اسے وہاں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ (ششماہی تحقیقی مجلّہ "خیابان"، پشاور، بہار 2007ء، شعبۂ اُردو، جامعہ پشاور، صفحہ 130-94۔)

حواشی وتعلیقات (بہ سلسلہ جلیلؔ قدوائی کی تحقیقی وتدوینی خدمات)

۱؎ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی: "حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی وادبی خدمات" جلد اوّل، طبع اوّل، ۱۹۹۳ء، لاہور، مجلس ترقی ادب، ص ۴۸۰۔

۲؎ رشید حسن خاں (مقالہ): "تدوین اور تحقیق کے رجحانات"، مشمولہ "اُردو میں اُصولِ تحقیق" مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش، جلد اوّل، طبع اوّل، ۱۹۸۶ء، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ص ۲۸۴۔

۳؎ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی: "برعظیم میں تدوین کا آغاز"، جلد اوّل، ایضاً محوّلہ بالا، ص ۱۸۰۔

۴؎ ایضاً، ص ۴۸۰

۵؎ ڈاکٹر عبادت بریلوی: "اُردو تنقید کا ارتقا"، طبع پنجم، ۲۰۰۱ء، کراچی، انجمن ترقی اُردو، ملخصاً، از صفحہ ۲۲۰ تا ۲۲۱۔

۶؎ ملخصاً، از مقالۂ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ بعنوان "ڈاکٹر عبدالحق کے تحقیقی کارنامے" مشمولہ "نقدِ عبدالحق" مرتبہ: ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن"، ۱۹۹۵ء، لاہور، الوقار پبلی کیشنز۔

۷؎ ڈاکٹر سیّد عبداللہ: "اشاراتِ تنقید"۔

۸؎ شہاب الدین ثاقب، ڈاکٹر: "بابائے اُردو مولوی عبدالحق۔ حیات اور علمی خدمات"، طبع اوّل، ۱۹۸۵ء، کراچی، انجمن ترقی اُردو، ص ۱۱۵۔۱۱۶۔

۹۔ ڈاکٹر شمس الدین بدایونی (مقالہ): ''قاضی عبدالودود کا رویۂ تحقیق'' مشمولہ: ''یادگار نامۂ قاضی عبدالودود'' مرتبین: پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر مختار الدین احمد، پروفیسر شریف حسین قاسمی، طبع اوّل، ۲۰۰۰ء، نئی دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، ص ۱۲۷۔

۱۰۔ ڈاکٹر سلیم اختر: ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، بارہواں ایڈیشن، ۱۹۸۶ء، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۲۰۹۔

۱۱۔ محمد حسین محوی کے مرتبہ ''دیوانِ بیدار'' کے بیک ٹائٹل پر اشاعت کا سال ۱۹۳۶ء درج ہے۔

۱۲۔ مشفق خواجہ ''جائزہ مخطوطاتِ اُردو''، جلد اوّل، لاہور، مرکزی اُردو بورڈ، طبع اوّل، فروری ۱۹۷۹ء، ص ۳۷۴

۱۳۔ محمد حسین محوی: ''مقدمۂ دیوانِ بیدار'' طبع اوّل، شاہی پریس مدراس، ۱۹۳۵ء، ۳۶۔۳۷

۱۴۔ ''کتاب کے خاتمے پر یا شروع میں تاریخ کتابت کے طور پر کہیں سال وغیرہ درج نہیں ہے۔ لیکن جلد کھولتے ہی جو ورق ملتا ہے اس کے کنارے پر کسی دوسرے خط میں بالکل غیر متعلق طریقے پر یکم ماہ فروری ۱۸۳۲ء لکھا ہے''۔ (جلیل قدوائی: مقدمہ ''دیوانِ بیدار''، ص ۸)

۱۵۔ جلیل قدوائی (مرتب): مقدمۂ ''دیوانِ بیدار''، طبع اوّل، الہ آباد، ہندستانی اکیڈمی، ۱۹۳۷ء، ص ۹۔۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۱

۱۷۔ مشفق خواجہ: ''جائزہ مخطوطاتِ اُردو''، جلد اوّل، لاہور، مرکزی اُردو بورڈ، فروری ۱۹۷۹ء، ص ۳۷۰

۱۸۔ ''فرہنگ عامرہ''، طبع اوّل، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء۔

۱۹۔ ایضاً، ''فرہنگِ عامرہ''۔

۲۰۔ ''فرہنگِ تلفظ''، طبع اوّل، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء۔

۲۱۔ جلیل قدوائی، ملخصاً از حاشیہ مکتوب عرشی بنام جلیل قدوائی، مطبوعہ ''سب رس''، کراچی، اگست ۱۹۸۲ء۔

۲۲۔ مکتوبِ مولانا امتیاز علی عرشی بنام جلیل قدوائی، محررّہ ۲۶ر فروری ۱۹۶۵ء، مطبوعہ، ایضاً۔

۲۳۔ جلیل قدوائی، حاشیۂ مکتوب امتیاز علی عرشی، ایضاً۔

۲۴۔ پروفیسر جمیل اختر مرحوم۔ ش الف

۲۵۔ اقتباس از مکتوب جلیل قدوائی بنام شاہ انجم، غیر مطبوعہ، محررہ ۱۳ر ستمبر ۱۹۸۹ء۔

۲۶۔ خلیق انجم، ''متنی تنقید''، طبع اوّل، ص ۱۴۳

۲۷۔ جلیل قدوائی، مقدمۂ دیوانِ بیدار، ایضاً، ص ۲۹۔

۲۸۔ ایضاً، مقدمۂ ''دیوانِ بیدار''، ص ۴

۲۹۔ ایضاً، ص ۲

۳۰ میر تقی میرؔ: ''نکات الشعرا''، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں، صفحہ ۱۴۰۔ بحوالہ جلیلؔ قدوائی، ایضاً ص ۳۔

۳۱ جلیلؔ قدوائی: ایضاً ص ۴۔

۳۲ ''تذکرۂ گلِ رعنا''، بحوالہ ایضاً ص ۴

۳۳ بحوالہ ایضاً ص ۴

۳۴ محمد حسین محوی: ''مقدمۂ دیوانِ بیدارؔ''، مطبوعہ ۱۹۳۵ء، مدراس، ص ۲۔

۳۵ مشفق خواجہ: ''جائزہ مخطوطاتِ اُردو''، جلد اوّل، لاہور، مرکزی اُردو بورڈ، طبع اوّل، فروری ۱۹۷۹ء، ص ۳۷۵۔

۳۶ ڈاکٹر جمیل جالبی: ''تاریخِ ادب اُردو''، جلد دوم، باردوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء، ص ۹۰۱

۳۷ جلیلؔ قدوائی: مقدمۂ ''دیوانِ بیدارؔ''، ص ۹

۳۸ مولوی عبدالحیٔ: ''گلِ رعنا''، بحوالہ جلیلؔ قدوائی، ایضاً ص ۹

۳۹ جلیلؔ قدوائی، ایضاً ص ۱۰

۴۰ ایضاً ص ۱۲

۴۱ ایضاً ص ۱۲

۴۲ ایضاً ص ۱۴

۴۳ ایضاً ۱۴

۴۴ ایضاً ص ۱۴

۴۵ ایضاً، حاشیہ ص ۲

۴۶ ایضاً ص ۲۴

۴۷ ایضاً ص ۲۵

۴۸ ایضاً ص ۲۶

۴۹ ایضاً ص ۲۷

۵۰ ایضاً ص ۲۸ تا ۲۹

۵۱ ایضاً ص ۷

۵۲ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخِ ادب اُردو، جلد دوم، بارِ دوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء، ص ۹۰۲

۵۳ مجنوں گورکھپوری: ''نقوش و افکار''، طبع اوّل، کراچی، صفیہ اکیڈمی، اپریل ۱۹۶۶ء، ص ۲۰۶

۵۴ مولانا حسرت موہانی: رسالۂ ''اُردوے مُعلی''، علی گڑھ، بابت د ، ۱۹۰۳ء، بحوالہ محمد حسین محوی صدیقی

لکھنوی (مرتب): مقدمۂ ''دیوانِ بیدارؔ''، طبع اوّل، یونیورسٹی آف مدراس، ۱۹۳۶ء۔

۵۵ مولانا حسرت موہانی: ''انتخابِ سخن''، حصہ اوّل، طبع کانپور، ۱۹۲۵ء۔

۵۶ مولانا محمد حسین محوی: مقدمۂ: ''دیوانِ بیدارؔ''، مدراس، ۳۶۔۱۹۳۵ء، ص ۲۵۔۲۴۔

۵۷ لالہ سری رام، حصہ اوّل، لاہور، ۱۹۰۸ء، بحوالہ ایضاً۔

۵۸ مجنوں گورکھپوری (مضمون) ''کلامِ بیدارؔ''، مشمولہ ''نقوش وافکار''، طبع اوّل، کراچی، ص ۲۰۹۔

۵۹ ایضاً، ص ۲۲۱۔

۶۰ ایضاً، ص ۲۰۹ تا ۲۱۳۔

۶۱ جلیلؔ قدوائی (مقالہ) ''میر محمدی بیدارؔ''، مطبوعہ ''ہندوستانی''، الٰہ آباد، جنوری ۱۹۳۲ء، ص ۱۱۸ تا ۱۳۸۔

۶۲ ایضاً، ص ۱۴۲۔

۶۳ تبصرہ بر ''دیوانِ بیدارؔ''، مطبوعہ ''زمانہ''، اگست ۱۹۳۷ء، جلد ۶۹، شمارہ نمبر ۲، صفحہ ۱۲۸ تا ۱۲۹۔

۶۴ مکتوب راس مسعود بنام جلیلؔ قدوائی (انگریزی) محررہ از بھوپال، ۱۱/اپریل ۱۹۳۷ء، مطبوعہ ومشمولہ ''خیابانِ مسعود''، مرتبہ: جلیلؔ قدوائی، کراچی، راس مسعود اکادمی، ۱۹۷۰ء، ص ۱۸۳۔

۶۵ جلیلؔ قدوائی: ''مکتوباتِ عبدالحق''، طبع اوّل، کراچی، مکتبۂ اسلوب، ۱۹۶۳ء

۶۶ ملاحظہ ہو: ''عبدالحق جوبلی کمیٹی کی کہانی''، از جلیلؔ قدوائی، مطبوعہ ومشمولہ ''تجزیے اور تجربے''، کراچی، راس مسعود سوسائٹی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۵۲۔

۶۷ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (تبصرہ): ''خطوط عبدالحق''، مطبوعہ، قومی زبان، کراچی، جنوری ۱۹۶۷ء، ص ۳۴

۶۸ ڈاکٹر داؤد رہبر کے نام خطوط کے نمبر شمار میں مرتب یا کاتب سے غلطی ہوگئی ہے۔ بجائے ۶۸ خطوط کے ۶۷ شمار کیے گئے ہیں، خط نمبر ۶۳ سے شمار میں غلطی ہوئی ہے۔

۶۹ ان تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: مشفق خواجہ: ''بابائے اُردو کی مکتوب نگاری''، ماہنامہ ''قومی زبان''، کراچی، جلد ۴۵، شمارہ ۸، اگست ۱۹۷۵ء

۷۰ جلیلؔ قدوائی: ''مکتوباتِ عبدالحق''، ۱۹۶۳ء، ''عرضِ مرتب''۔

۷۱ ایضاً، مقدمہ، ص ۹

۷۲ ایضاً: مقدمہ، ص ۹

۷۳ ایضاً، ص ۱۵

۷۴ جلیلؔ قدوائی (مضمون): ''بابائے اُردو کی خط نگاری''، مطبوعہ ''قومی زبان''، کراچی، جلد ۵۶، شمارہ ۲۲، دسمبر ۱۹۸۵ء،

اب مشمولہ ''تجزیے اور تجربے''، طبع اوّل، کراچی، راس مسعود اکادمی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۹۔

۷۵ مولوی محمد امین زبیری، مہتمم تاریخ ریاست بھوپال، بحوالہ جلیل قدوائی ''مکتوباتِ عبدالحق''، ص ۵۲ کا حاشیہ

۷۶ اقتباس از مکتوب عبدالحق بنام مولوی محمد امین زبیری مشمولہ ''مکتوباتِ عبدالحق''، ایضاً، ص ۱۵۸۔۱۵۷

۷۷ افسر الاطبا، حکیم امتیاز الدین مرحوم، یاد رہے یہی خط ''چند ہم عصر'' میں شخصی مضمون کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔

۷۸ اقتباس از مکتوب عبدالحق بنام سیّد ہاشمی فرید آبادی مشمولہ ''مکتوباتِ عبدالحق''، ایضاً، ص ۸۲۔۴۸۰

۷۹ جلیل قدوائی (مقدمہ): ''مکتوباتِ عبدالحق''، ص ۲۴ تا ۲۵۔

۸۰ ایضاً، ص ۲۵

۸۱ ایضاً، ص ۲۶

۸۲ ایضاً، ص ۲۸ تا ۲۹

۸۳ ایضاً، ص ۲۹

۸۴ ایضاً، ص ۲۹

۸۵ ایضاً، ص ۲۹

۸۶ مولوی عبدالحق: ''قواعدِ اُردو''، اشاعت سترہویں، نئی دہلی، انجمن ترقی اُردو ہند، ۱۹۹۶ء، ص ۲۰۳

۸۷ جلیل قدوائی (مقدمہ): ''مکتوباتِ عبدالحق''، ص ۳۱

۸۸ مشفق خواجہ: ''حرفے چند''، مشمولہ ''خاکسرانہ''، (تیسرا شعری مجموعہ) از جلیل قدوائی: بارِ اوّل، کراچی، مکتبۂ ہم زبان، اگست ۱۹۸۸ء، ص ۱۹۔

۸۹ مکتوب سیّد ہاشمی فرید آبادی بہ نام ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مطبوعہ و مشمولہ ''انشائے ہاشمی''، مرتبہ جلیل قدوائی، بار اوّل، کراچی، راس مسعود سوسائٹی، ۱۹۹۲ء، ص ۶۴ کا حاشیہ۔

۹۰ مکتوب سیّد ہاشمی فرید آبادی بہ نام جلیل قدوائی مشمولہ، ایضاً، ص ۴۵

۹۱ شجاع احمد زیبا: حاشیہ بر مکتوب ہاشمی بنام مشفق خواجہ محررہ ۲۴ر جنوری ۱۹۶۱ء، مشمولہ ''انشائے ہاشمی''، مرتبہ جلیل قدوائی، ص ۵۴

۹۲ حاشیہ بر مضمون ''عبدالحق جوبلی کمیٹی کی کہانی''، مشمولہ ''تجزیے اور تجربے''، مرتبہ جلیل احمد قدوائی، ص ۱۶۳

۹۳ ڈاکٹر سیّد معراج نیّر زیدی: ''بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ فن اور شخصیت''، طبع اوّل، لاہور، ابلاغ، ۱۹۹۵ء، ص ۱۸۱۔۱۸۰

۹۴ اقتباس از مکتوب ڈاکٹر مختار الدین احمد بنام جلیل قدوائی، محررہ ۹ر جولائی ۱۹۹۲ء، مطبوعہ و مشمولہ ''تحقیق'' جام

شورو، شمارہ: ۱۶، ص ۶۴، ۲۰۰۸ء۔

۹۵ اقتباس از مکتوب ڈاکٹر مختار الدین احمد بنام جلیل قدوائی، محررہ، ۳؍ مارچ ۱۹۹۲ء، مطبوعہ و مشمولہ ''تحقیق'' جام شورو، ایضاً ص ۱۴۰۔

۹۶ ''انشائے ہاشمی''، مرتبہ جلیل قدوائی، بارِ اوّل، کراچی، راس مسعود سوسائٹی، ۱۹۹۲ء

۹۷ ''مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی (۱۸۹۰ء۔۱۹۶۴ء) فرید آباد میں نواب شفیع فرید آبادی کے ہاں پیدا ہوئے۔ اُن کا نانہالی سلسلہ مرتضیٰ خاں شیخ فرید سے ملتا ہے جو قصبہ فرید آباد کے بانی تھے۔ آپ کے والد نے ہاشمی فرید آبادی کا نام پیدائش کے وقت سیّد ہاشم علی رکھا تھا اور وہ اسی نام سے معروف رہے۔ آپ کو ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی کے اینگلو عربک ہائی اسکول میں داخل کیا گیا۔ ابھی وہ نویں جماعت میں تھے کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے ۱۹۰۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ ''پیسہ'' اخبار میں نائب مدیر کی حیثیت سے ملازمت کی بعد ازاں علی گڑھ چلے گئے۔ ۱۹۱۲ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے امتحان ایف اے میں شریک ہو کر درجہ دوم میں کامیاب ہوئے۔ جنگ بلقان کے حوالے سے سیاسی نظمیں لکھیں جس کی بناء پر علی گڑھ کالج سے نام خارج کر دیا گیا۔ اس وقت ہاشمی مرحوم سال چہارم کے طالب علم تھے۔ علی گڑھ کے دورانِ قیام ہاشمی صاحب کے مولانا حسرت موہانی سے قریبی تعلقات اور مراسم بھی اُن کے اخراج کا بڑا سبب بن گئے تھے۔ علی گڑھ سے نکلنے کے بعد وہ حیدر آباد دکن چلے گئے جہاں وہ دارالترجمہ کے مترجم مقرر ہو گئے۔ حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں آپ نے بہت سی کتابیں ترجمہ اور تالیف کیں۔ آپ ابتدا ہی سے مولوی عبدالحق کے کاموں اور انجمن کی تحریکوں میں شریک رہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد مولوی صاحب کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔ اگرچہ انھیں ماڈل ٹاؤن لاہور میں مکان مل گیا تھا۔ مگر وہ کراچی آتے جاتے رہے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد مستقلاً کراچی آ گئے اور انجمن کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے انجمن کی پنجاہ سالہ تاریخ لکھی۔ اس کے علاوہ 'تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت' دو جلدوں میں لکھی اس کے علاوہ فلپ ہٹی کی مشہور ''تاریخ عرب' کا ترجمہ بھی کیا۔ ۱۹۵۴ء میں واپس لاہور چلے گئے۔ جہاں مولوی محمد شفیع نگراں انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے ساتھ مل کر کئی مقالوں کے ترجمے اور تصحیح وغیرہ کی خدمت انجام دی۔ کراچی میں جب اُردو لغت بورڈ قائم ہوا تو مولوی عبدالحق نے جو مجوزہ لُغت کے چیف ایڈیٹر اعزازی تھے ہاشمی صاحب کو ایک ایڈیٹر کے طور پر واپس کراچی بلا لیا۔ یہاں اگست ۱۹۶۰ء تک آپ نے کام کیا۔ لاہور چلے جانے کے کچھ عرصے بعد ۱۹۶۴ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔''

[ملخصاً از ''سیّد ہاشمی'' فرید آبادی مختصر حالات''، شجاع احمد زیبا، مشمولہ انشائے ہاشمی، ایضاً ص ۱۴ تا ۱۹]۔

۹۸ جلیل قدوائی: ''انشائے ہاشمی''، ''گزارش''، ص ۶

۹۹ اقتباس از مکتوب سیّد ہاشمی فرید آبادی بہ نام جلیلؔ قدوائی، مشمولہ ایضاً، ص ۳۴۔

۱۰۰ جلیلؔ قدوائی: ''ہاشمی صاحب اور میں''، مشمولہ ایضاً: ص ۱۲۔

حواشی و تعلیقات بہ سلسلۂ مشمولاتِ متن

۱۰۱ جلیلؔ قدوائی: (مضمون) ''غالب کا الحاقی کلام، ایک داستان''، مطبوعہ سہ ماہی ''اُردو''، کراچی، جلد نمبر ۴۵، شمارہ، جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۳۳۵، طبع ثانی و مشمولہ: ''شعرِ اُشعریات''، اگست ۱۹۸۲ء، کراچی، راس مسعود سوسائٹی، ص ۲۵۳

۱۰۲ جلیلؔ قدوائی (مضمون): ''الحاقی کلامِ غالبؔ کی داستان''، مشمولہ ''شعرِ اُوشعریات''، ایضاً، ص ۲۵۵

۱۰۳ ایضاً، ص ۲۵۶

۱۰۴ ایضاً، ص ۲۶۰

۱۰۵ ایضاً، ص ۲۶۰

۱۰۶ ایضاً، ص ۲۶۰ کا حاشیہ نمبر ۱۔

۱۰۷ ایضاً، ص ۲۵۷ تا ۲۵۸

۱۰۸ ایضاً، ص ۲۶۲

۱۰۹ اقتباس از مکتوب جلیلؔ قدوائی، بحوالہ مکتوب مولانا امتیاز علی عرشی رام پوری بنام جلیلؔ قدوائی، محرّرہ ۲۲/مارچ ۱۹۶۱ء، مطبوعہ ''سب رس''، کراچی، اگست ۱۹۸۲ء، ص ۱۹

۱۱۰ مکتوب مولانا امتیاز علی عرشی، بنام: جلیلؔ قدوائی، محرّرہ یکم ستمبر ۱۹۵۹ء، مطبوعہ ''سب رس''، کراچی، اگست ۱۹۸۲ء، ص ۱۸

۱۱۱ جلیلؔ قدوائی: حاشیہ بر مکتوب مولانا امتیاز علی عرشی، مطبوعہ، ایضاً، ص ۲۲

۱۱۲ جلیلؔ قدوائی (مضمون): ''الحاقی کلامِ غالبؔ کی داستان''، مشمولہ ''شعراء و شعریات''، ص ۲۶۱

۱۱۳ ایضاً، ص ۲۶۲

۱۱۴ ایضاً، ص ۲۶۳

۱۱۵ ایضاً، ص ۲۶۴

۱۱۶ مکتوبِ مولانا امتیاز علی عرشی رام پوری بنام جلیلؔ قدوائی محرّرہ ۲۲/اپریل ۱۹۶۱ء، از رام پور، مطبوعہ ''سب رس''، کراچی، اگست ۱۹۸۲ء۔

۱۱۷ جلیلؔ قدوائی (مضمون): ''الحاقی کلامِ غالبؔ کی داستان''، مشمولہ ''شعرِ اُوشعریات''، اگست ۱۹۸۲ء، ملخصاً، ص ۱۹۔

۱۱۸ ایضاً، ص ۲۶۵

۱۱۹ اقتباس از مکتوب مولانا امتیاز علی عرشی رام پوری، محررہ ۲۲/ مارچ ۱۹۶۱ء، بنام جلیل قدوائی، مطبوعہ ''سب رس''، کراچی، اگست ۱۹۸۲ء، ص ۱۹۔

۱۲۰ ''جگر لخت لخت'' (۱) مشمولہ سہ ماہی ''العلم''، کراچی، جولائی تا ستمبر ۱۹۶۲ء

۱۲۱ جلیل قدوائی (مضمون): ایضاً، ص ۱۴ تا ۱۸۔

۱۲۲ ایضاً، محولا بالا، صفحہ ۱۴ کا فٹ نوٹ۔

۱۲۳ مالک رام (مضمون): ''جگر مرادآبادی''، مشمولہ ''نقوش''، لاہور، شمارہ ۸۲۔۸۱، جون ۱۹۶۰ء، ص ۱۱۷۔

۱۲۴ شریف الحسن عثمانی (مضمون): ''مسودۂ شعلۂ طور ایک تعارف''، ''ہماری زبان''، علی گڑھ، ۱۵/ مارچ ۱۹۶۹ء، بحوالہ: ڈاکٹر احمر رفاعی: ''شعلۂ طور''، طباعت اوّلین و مابعد ''ایک تجزیاتی مطالعہ'' طبع اوّل، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۰

۱۲۵ جلیل قدوائی (مضمون): ''پہلا شعلۂ طور اور ترتیبِ کلامِ جگر''، مطبوعہ، ماہنامہ ''فاران''، کراچی، جلد نمبر ۳۲، شمارہ ۱، اگست تا اکتوبر ۱۹۸۰ء، ص ۶۸۔

۱۲۶ ایضاً، ملخصاً، ص ۶۸۔

۱۲۷ ڈاکٹر احمر رفاعی: ''شعلۂ طور''، طباعت اوّلین و مابعد، ایک تجزیاتی مطالعہ، بار اوّل، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۰

۱۲۸ آلِ احمد سرور، حاشیہ بر مضمون شریف الحسن عثمانی، ''مسودۂ شعلۂ طور ایک تعارف''، مطبوعہ، ہماری زبان، علی گڑھ، ۱۵/ مارچ ۱۹۶۹ء

۱۲۹ جلیل قدوائی (مضمون): ''اصغر صاحب اور میں''، مطبوعہ ''قومی زبان''، کراچی، بابت ستمبر اور اکتوبر ۱۹۷۴ء

۱۳۰ جلیل قدوائی (مضمون): ''پہلا شعلۂ طور اور ترتیبِ کلامِ جگر''، مطبوعہ، ماہنامہ ''فاران''، کراچی، اگست تا اکتوبر ۱۹۸۰ء، ملخصاً، ص ۶۸۔

۱۳۱ جلیل قدوائی (مقالہ): اقبال کی بعض نظموں کا ابتدائی متن''، مطبوعہ ''ہمایوں''، لاہور، مئی ۱۹۵۱ء، بعد نظر ثانی و طبع ثانی، سہ ماہی ''اُردو''، کراچی، ۱۹۵۲ء، ص ۱۲۰، نیز مشمولہ: (i) ''تنقیدیں اور خاکے''، مرتبہ جلیل قدوائی، کراچی۔ (ii) ڈاکٹر رحیم بخش شاہین: ''اوراقِ گم گشتہ''، طبع اول، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، لمیٹڈ، ۱۹۷۵ء۔

۱۳۲ جلیل قدوائی (مقالہ): ''اقبال کی بعض نظموں کا ابتدائی متن''، مشمولہ: ''تنقیدیں اور خاکے''، ۱۹۵۲ء، کراچی، اُردو اکیڈمی، سندھ۔

۱۳۳ ایضاً، ص ۱۳۸

۱۳۴ خان بہادر قاضی نذیر احمد قدوائی مرحوم وکیل و اسپیشل مجسٹریٹ، اُناؤ، بحوالہ جلیل قدوائی، ایضاً، ص ۱۳۸

۱۳۵۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۱۳۶۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۱۳۷۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۱۳۸۔ جلیل قدوائی (مقدمہ): ''مکتوباتِ عبدالحق''، طبع اوّل، کراچی، مکتبۂ اسلوب، ۱۹۶۳ء، ص ۲۵۔

۱۳۹۔ عماد پریس حیدرآباد، ۱۳۷۳ھ، بحوالہ ڈاکٹر گیان چند: ''ابتدائی کلام اقبال۔ بہ ترتیب مہ و سال''، کراچی، شائستہ پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۸ء، کتابیات، ص ۴۴۷۔

۱۴۰۔ مملوکہ جناب عبدالصمد خاں، بحوالہ: ڈاکٹر گیان چند، ایضاً۔

۱۴۱۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۹ء، بحوالہ ایضاً۔

۱۴۲۔ طبع اول، لاہور، ۱۹۵۲ء، طبع سوم، ۱۹۷۸ء، بحوالہ ایضاً۔

۱۴۳۔ طبع دوم، کراچی، نومبر ۱۹۷۷ء، بحوالہ، ایضاً۔

۱۴۴۔ طبع اوّل، لاہور، ۱۹۵۹ء، بحوالہ، ایضاً۔

۱۴۵۔ طبع دوم، کراچی، اگست ۱۹۶۵ء۔

۱۴۶۔ مشمولہ: ''اوراقِ گم گشتہ''، مرتبہ: ڈاکٹر رحیم بخش شاہین، طبع اوّل، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۷۵ء۔

۱۴۷۔ ڈاکٹر گیان چند، ایضاً، ۱۹۸۸ء، کراچی۔

۱۴۸۔ جلیل قدوائی (مقالہ): ''اقبال کی بعض نظموں کا ابتدائی متن''، مشمولہ ''تنقیدیں اور خاکے''، ۱۹۵۲ء، ص ۱۳۵۔

۱۴۹۔ ایضاً: ص ۱۳۹

۱۵۰۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی: (مقالہ) ''تنقیدِ متن''، مشمولہ ''اُردو میں اُصولِ تحقیق''، مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، جلد اوّل، ص ۲۶۵

۱۵۱۔ ایضاً، ص ۳۶۴

۱۵۲۔ جلیل قدوائی، ایضاً، محولا بالا، ص ۱۳۹

۱۵۳۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۱۵۴۔ ایضاً، ص ۱۵۲ تا ۱۵۳

۱۵۵۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۱۵۶۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۱۵۷۔ ایضاً، ص ۱۵۳ تا ۱۵۵

۱۵۸ ایضاً: ص ۱۴۸

۱۵۹ ایضاً: ص ۱۴۹۔۱۴۸

۱۶۰ ایضاً: ص ۱۵۰۔۱۴۹

۱۶۱ ایضاً: ص ۱۶۸

۱۶۲ علامہ اقبال (نظم): ''ابر کوہسار''، مطبوعہ ''مخزن''، لاہور، جلد ۲، نمبر ۲، بابت نومبر ۱۹۰۱ء، ص ۳۹ تا ۴۰۔

۱۶۳ بیاضِ جلیل (بحوالہ): ''تنقیدیں اور خاکے''، ص ۱۶۹

۱۶۴ جلیل قدوائی: ''تنقیدیں اور خاکے''، ص ۱۶۹

۱۶۵ ایضاً: ص ۱۷۰

۱۶۶ شاہ انجم (مقالہ) ''راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی آف پاکستان کی تعلیمی، سماجی اور ادبی خدمات کا جائزہ'' مطبوعہ شعبہ جاتی مجلّہ ''تحقیق''، شعبۂ اُردو، یونی ورسٹی آف سندھ، جام شورو، شمارہ نمبر ۱۶، ۲۰۰۸ء، صفحہ ۱۹۱ تا ۲۳۲۔

۱۶۷ مشفق خواجہ (مضمون): ''حرفے چند'' مشمولہ ''خاکسترِ پروانہ'' (جلیل قدوائی کا تیسرا مجموعہ کلام)، طبع اوّل، کراچی، اگست، ۱۹۸۸ء، ص ۱۹۔

۱۶۸ ایضاً: ص ۱۹۔

۱۶۹ ایضاً: ص ۱۹۔

۱۷۰ مشمولہ ''اوراقِ گُل''، مرتبہ: جلیل قدوائی، طبع اوّل، کراچی، راس مسعود اکادمی، ۱۹۸۹ء، ص ۳۹ تا ۴۶۔

۱۷۱ مشمولہ ''خیابانِ مسعود''، مرتبہ: جلیل قدوائی، طبع اوّل، کراچی، راس مسعود اکادمی، ۱۹۷۰ء، ص ۱۶۷ تا ۱۸۲۔ پروفیسر ہارون خان شروانی، سر راس مسعود کے قریبی دوست اور آکسفورڈ میں ان کے ساتھ تھے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: صفحہ ۱۶۷ کا فٹ نوٹ۔

۱۷۲ ایضاً: ص ۱۷۳۔

۱۷۳ مدیران ''نظام گزٹ''، حیدرآباد دکن، مشمولہ ''خیابانِ مسعود''، ایضاً: ص ۱۷۷۔

۱۷۴ مشمولہ ''خیابانِ مسعود''، ایضاً: ص ۱۷۹۔

۱۷۵ مشمولہ: ''شعلۂ مستعجل''، مرتبہ: جلیل قدوائی، طبع اوّل، کراچی، راس مسعود اکادمی، ۱۹۸۲ء، ص ۹۷۔

۱۷۶ مشمولہ: ''شعلۂ مستعجل''، ایضاً: ص ۱۰۷ تا ۱۲۰۔

۱۷۷ مشمولہ: ''شعلۂ مستعجل''، ایضاً: ص ۱۲۱ تا ۱۳۰۔ علاوہ ازیں راس مسعود کے چھ خطوط امین زبیری کے نام ملاحظہ ہوں: ''اوراقِ گُل''، مرتبہ: جلیل قدوائی، طبع اوّل، کراچی، راس مسعود اکادمی، ۱۹۸۹ء، ص ۷۷ تا ۸۵۔

۱۷۸ مشمولہ: ''شعلۂ مستعجل''، ایضاً: ص ۱۳۳ تا ۱۴۰۔

۱۷۹ ایضاً: ص ۱۴۳ تا ۱۴۸۔

۱۸۰ مشمولہ: ''شعلۂ مستعجل''، ایضاً: ص ۱۵۳۔ علاوہ ازیں گیارہ خطوط، مشمولہ ''اوراقِ گُل''، مرتبہ: جلیلؔ قدوائی، ۱۹۸۹ء، ایضاً، محولہ بالا، ص ۴۶ تا ۶۸۔

۱۸۱ مشمولہ ''اوراقِ گُل''، ایضاً: ص ۸۹۔

۱۸۲ مشمولہ ''اوراقِ گُل''، ایضاً: ص ۹۵۔

۱۸۳ مشمولہ ''اوراقِ گُل''، ایضاً: ص ۱۰۰۔

۱۸۴ مشمولہ ''اوراقِ گُل''، ایضاً: ص ۱۱۲۔ اس کا اصل متن ملاحظہ ہو ''شعلۂ مستعجل''، ایضاً، محولا بالا، ص ۴۵۔

۱۸۵ مشمولہ ''شعلۂ مستعجل''، مرتبہ: جلیلؔ قدوائی، ص ۷۳ اور ۷۹۔ سیّد یوسف بخاری دہلوی، امام جامع مسجد دہلی کے حقیقی برادر زادے تھے اور ان کے دادا سر سیّد کے حقیقی خالہ زاد تھے۔ تفصیل اور حوالے کے لیے دیکھیں ایضاً: ص ۶۹ تا ۸۲۔

۱۸۶ مشمولہ ''اوراقِ گُل''، مرتبہ: جلیلؔ قدوائی، ص ۶۸۔

۱۸۷ راس مسعود کے ایک دوست۔ انگریزی خط مشمولہ ''شعلۂ مستعجل''، ص ۸۰۔۷۹۔

۱۸۸ مشمولہ ''شعلۂ مستعجل''، مرتبہ: جلیلؔ قدوائی، ص ۸۶۔

۱۸۹ ایضاً: ص ۸۷۔

۱۹۰ ایضاً: ص ۹۵۔

۱۹۱ ایضاً: ص ۹۹ تا ۱۱۹۔

۱۹۲ ایضاً: ص ۱۲۱ تا ۱۲۹۔ علاوہ ازیں مشمولہ ''اوراقِ گُل''، مرتبہ: جلیل قدوائی، ص ۷۰ تا ۸۳۔

۱۹۳ ''شعلۂ مستعجل''، ایضاً: ص ۱۳۰ تا ۱۴۱۔

۱۹۴ ایضاً: ص ۱۴۱ تا ۱۵۲۔

۱۹۵ ایضاً: ص ۱۵۲۔

۱۹۶ ''اوراقِ گُل''، مرتبہ: جلیلؔ قدوائی، ص ۸۸۔

۱۹۷ ایضاً: ص ۹۰۔

۱۹۸ ایضاً: ص ۹۱۔

۱۹۹ ایضاً: ص ۹۳۔

۲۰۰ ایضاً: ص ۹۴۔

۲۰۱ ایضاً: ص۹۶۔

۲۰۲ ایضاً: ص ص۱۰۳ تا ۱۰۸۔

۲۰۳ ایضاً: ص۱۰۹۔ علاوہ ازیں اس خط کا انگریزی متن ملاحظہ ہو 'شعلۂ مستعجل'، ص۳۴۔

۲۰۴ مشمولہ 'شعلۂ مستعجل'، ص۱۵۵۔

۲۰۵ یوپی میں ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن سے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے پرووائس چانسلر ہوکر گئے تھے بعد میں ''سر'' کا خطاب ملا۔ مرکزی حکومت کی جانب سے رحمت اللہ تحقیقاتی کمیٹی کے رکن تھے۔ یہ خط ''شعلۂ مستعجل'' میں شریکِ اشاعت ہے۔ دیکھیے صفحہ نمبر ۴۸۔۴۷۔

۲۰۶ مشمولہ 'شعلۂ مستعجل' ایضاً: ص۵۴ تا ۵۸۔

۲۰۷ مشمولہ ایضاً: ص۵۸ تا ۶۰۔

۲۰۸ مشمولہ ایضاً: ص۶۰ تا ۶۲۔

۲۰۹ Karachi, Ross Masood Academy, 1984.

۲۱۰ ملخصاً از ''ای ایم فوسٹر اے لائف'' مصنفہ: پی این فربینک (جلد اوّل)

PN Furbank: "EM Forster A life" (Volume one) First Published in England 1977. Secker and warburg, pages 6-7 and see on the flap abid.

۲۱۱ جلیل قدوائی (مرتب): 'فوسٹر۔ مسعود لیٹرز'، ۱۹۸۴ء، ملخصاً از "Preface"، ص۱۷۔

۲۱۲ ایضاً، ص۱۷

۲۱۳ ایضاً، حواشی نمبر ۵، بہ سلسلہ "She saved Forster-Masood letters"، ص۱۶۰۔

۲۱۴ ایضاً ملخصاً، ص۱۷۔

۲۱۵ ای۔ ایم فوسٹر (مضمون): "None was nor will be like him" ''مرقع مسعود'' مرتبہ: جلیل قدوائی، کراچی، راس مسعود اکیڈمی، ۱۹۶۶ء، ص۷۔۴

۲۱۶ ایضاً، ص۴

۲۱۷ جلیل قدوائی (مرتب): ''فوسٹر۔ مسعود لیٹرز''، انتساب، ص۳

۲۱۸ ایضاً، ص۱۵

۲۱۹ ملاحظہ ہو: ''اوراقِ گُل''، مرتبہ: جلیل قدوائی، طبع اوّل، کراچی، راس مسعود اکیڈمی، ۱۹۸۹ء، ص۱۱۵ تا ۱۱۹۔

۲۲۰ اقتباس از مکتوب بیگم چھتاری (سابق لیڈی مسعود) بنام جلیل قدوائی، مطبوعہ ومشمولہ ایضاً، ص ۱۱۶۔

۲۲۱ جلیل قدوائی: ملخصاً از حواشی نمبر ۳، بہ سلسلہ مکتوب بیگم چھتاری بنام جلیل قدوائی، محررہ لگ بھگ مارچ ۱۹۷۸ء (خط پر تاریخ درج نہیں ہے یہ تاریخ جلیل قدوائی کی متعین کردہ ہے) از کراچی۔ مطبوعہ ومشمولہ ''اوراقِ گُل'' ایضاً، محولہ بالا، ص ۱۱۸۔

۲۲۲ خلیق انجم: ''متنی تنقید''، طبع ثانی، کراچی، انجمن ترقی اُردو، ۲۰۰۶ء، ص ۲۰۔

۲۲۳ بیگم نواب زادہ راحت سعید خان آف چھتاری، جناب عبدالرشید (۱۹۴۶ء۔۱۸۸۴ء) کی صاحبزادی تھیں۔ آپ کی پہلی شادی راس مسعود سے ہوئی۔ راس مسعود کے انتقال کے بعد نواب زادہ راحت سعید چھتاری سے آپ کا عقد ثانی ہوا۔ ''عبدالرشید۔ ریاست اندور (انڈیا) میں وزیر تھے۔ انگلستان میں مسعود کے دورِ طالب علمی میں ان کے مخصوص ''حلقۂ یاراں''، مشتمل بر ہارون خان شروانی، ابوسعید مرزا، ایس۔ ایم۔ میر وغیرہ کے رکن''۔ (بحوالہ جلیل قدوائی: ''اوراقِ گل''، حواشی نمبر ۹، ص ۱۱۹)۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: ''Apendix (iv)'' مشمولہ ''فوسٹر۔ مسعود لیٹرز''، مرتبہ جلیل قدوائی، ص ۱۳۳ تا ۱۳۷۔

۲۲۴ بیگم چھتاری کا انتقال ۱۱ر مارچ ۱۹۷۹ء کو کراچی میں ہوا۔ بہ حوالہ جلیل قدوائی، ایضاً، ص ۱۳۷۔

۲۲۵ "Forster, Masood Letters"، ایضاً، ص ۱۰۔

۲۲۶ پروفیسر آف انگلش، گورنمنٹ کالج مدھیہ پردیش، آپ نے فوسٹر پر تحقیقی کام کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ آپ کی کتاب شائع ہو چکی ہے "Forster Interest in Indian Culture"، بحوالہ جلیل قدوائی: ایضاً، ص ۱۱۔۹۔

۲۲۷ جلیل قدوائی (مرتب): ''فوسٹر۔ مسعود لیٹرز''، "Acknowledgements"، ص ۱۱

۲۲۸ ڈاکٹر بختیار احمد قدوائی، جلیل قدوائی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ آغا خان میڈیکل کالج کراچی سے ایم بی بی ایس کیا۔ یو کے سے ای این ٹی کے شعبے میں اسپیشلائیزیشن کر کے وہیں ملازمت کرتے رہے ہیں، آج کل کینڈا میں ملازمت کر رہے ہیں اور وہیں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مقیم ہیں۔ راقم کا ان سے فون پر رابطہ ہے۔ نہایت با اخلاق اور ملنسار شخصیت کے مالک ہیں۔ جلیل قدوائی کے انتقال کے وقت آپ اسپتال میں موجود تھے۔ آپ نے ان کی دیکھ بھال اور خدمت گزاری میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔

۲۲۹ میجر خالد قدوائی نے پاکستان آرمی میں لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے تک ترقی کی اور اسٹریٹیجک کمانڈ اینڈ کنٹرول کے سربراہ بنے۔ ریٹائر ہونے کے بعد راول پنڈی ہی میں قیام ہے۔ بیگم ہرمزی کی وفات کے بعد سے آخر دم تک جلیل قدوائی آپ ہی کے ساتھ رہے۔ اس مقالے کے سلسلے میں بھی آپ نے راقم الحروف سے ہر ممکن تعاون کیا۔

۲۳۰ سیّد بشیر الدین احمد، جلیل قدوائی کے بڑے داماد اور ڈاکٹر پروین کے شوہر ہیں۔ آپ کا تعلق حیدر آباد دکن میں موجود جلیل کے اعزّاء سے ہے۔ کراچی یونیورسٹی سے فزکس میں ایم ایس سی کرنے کے بعد ''یو کے'' سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ برطانیہ کے متعدد اعلیٰ اداروں میں طیاروں کی انجن سازی اور دیکھ بھال کے سلسلے میں خدمات انجام دے چکے ہیں۔ کچھ عرصہ نیٹو کے ساتھ بھی کام کیا ہے۔ جلیل قدوائی اپنے دورۂ برطانیہ میں انھی کے یہاں قیام کرتے تھے۔ جلیل قدوائی سے معروف اسکالر پی این فربینک نے آپ ہی کے گھر ملاقات کی تھی۔ طویل عرصہ برطانیہ میں گزارنے کے باوجود آپ کی اُردو قابلِ رشک ہے۔ زیرِ تحقیق مقالے کے سلسلے میں متعدد مواقع پر آپ نے راقم کی رہنمائی فرمائی ہے۔

۲۳۱ جلیل قدوائی (مرتب): ''فوسٹر۔ مسعود لیٹرز''، Acknowledgements، ص ۱۳۔

۲۳۲ Jalil Kidwai: "Forster-Masood Letters", "Preface" Abid page No.30

۲۳۳ E. M. Forster: Abid letter no.01, page No. 43

۲۳۴ Abid, letter No.21, dated 2/1/11 page No.64

۲۳۵ Abid, letter No.22 dated 4.2.11 page No.65

۲۳۶ Ross Masood's Letter to E.M. Foster Letter no. 7 dated 20.12.1910 Abid page No.103.

۲۳۷ Abid letter No.11 dated 15.3.14 page No.109

۲۳۸ Abid page No.110

۲۳۹ Masood' letter, No.12, Abid page No.113.

۲۴۰ Abid letter No.11, page No.111

۲۴۱ بحوالہ انگریزی مکتوب ڈاکٹر مسز پروین بشیر احمد بنام Prof. Pegram Harrison (غیر مطبوعہ) محررّہ، ۳۰ مئی ۱۹۹۵ء، از کینل ورتھ، برطانیہ، فوٹو اسٹیٹ، مملوکہ راقم۔

۲۴۲ "Realms of Gold" by Syed Ross Mashood Edited by Jalil Ahmed Kidwai, Ross Masood Academy 1986, Karachi.

۲۴۳ ڈاکٹر احسان رشید کے توسط سے یہ بیاض جلیل قدوائی کو ملی۔ بحوالہ ''چند اکابر چند معاصر''، ص ۴۱ کا حاشیہ۔

۲۴۴ جلیل قدوائی (مضمون) ''سر سیّد راس مسعود''، مشمولہ ''چند اکابر، چند معاصر''، ص ۳۹۔

۲۴۵ جلیل قدوائی (مضمون): ''سر سیّد راس مسعود''، ایضاً، ص ۴۱

۲۴۶ ایضاً، فٹ نوٹ ص ۴۱

۲۴۷ Jalil Ahmed Kidwai: Edited "Realms of Gold" Foreword, Page No.15.

۲۴۸ "Travel in Japan" مرتبہ: جلیل قدوائی، طبع اوّل، کراچی، راس مسعود اکادمی، ۱۹۶۸ء۔

۲۴۹ اے بی اے حلیم، B.A (Oxon), Barrister-at-Law, D. Litt. معتمر عالم اسلامی پاکستان کے صدر ہونے کے علاوہ آپ سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پرووائس چانسلر بھی رہ چکے تھے، آپ کی شخصیت کے حوالے سے مزید معلومات کے لیے جلیل قدوائی کا مضمون ملاحظہ ہو: ''پروفیسر اے بی اے حلیم'' مشمولہ ''چند اکابر، چند معاصر'' طبع اوّل، کراچی، ادارۂ نگارش و مطبوعات، ۱۹۷۷ء، ص ۷۹۔

۲۵۰ تحسین سروری: (تبصرہ) ''سیاحتِ جاپان'' مشمولہ ''اُردو نامہ''، کراچی، شمارہ ۳۳، ملخصاً، ص ۲۰۳۔

۲۵۱ ایضاً، ملخصاً، ص ۲۰۴۔

۲۵۲ ایضاً: ص ۲۰۴۔

۲۵۳ Jalil A. Kidwai: "Travels in Japan", Preface, Page No: (xiii)

۲۵۴ Prof: A. B.A. Haleem Abid "Introduction" Page No: xx-xxi.

۲۵۵ Jalil A. Kidwai, Abid "Preface" Page No: xiii.

۲۵۶ Abid, Page No: xiv.

۲۵۷ Abid, Page No: xi-xii.

۲۵۸ Ross Masood: wiith reference to preface See Abid Page No:xi

۲۵۹ تحسین سروری (تبصرہ): ''سیاحت جاپان''، مشمولہ ''اُردو نامہ''، کراچی، شمارہ ۳۳، ص ۲۰۵۔

۲۶۰ اقتباس از مکتوب ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین بنام جلیل قدوائی، مطبوعہ و مشمولہ ''خیابان مسعود''، مرتبہ: جلیل قدوائی، طبع اوّل، کراچی، ۱۹۷۰ء، ص ۱۹۹۔

حواشی و تعلیقات بہ سلسلۂ راس مسعود

۲۶۱ جلیل قدوائی (مرتب): ''مجلّہ یادگار مسعود'' طبع اوّل، مارچ۔اپریل ۱۹۶۴ء، کراچی، راس مسعود سوسائٹی۔ اس مجلّے کی فوٹو کاپی مجھے جلیل صاحب کی صاحبزادی ڈاکٹر یاسمین علی خان نے ڈربی شائر (برطانیہ) سے عنایت کی۔ جس کے لیے راقم ان کا شکر گزار ہے۔

۲۶۲ جلیل قدوائی (مرتب): ''مرقعِ مسعود''، طبع اوّل، کراچی، راس مسعود اکادمی، ۱۹۶۶ء۔

۲۶۳۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (تبصرہ): ''مرقعِ مسعود''، مطبوعہ سہ ماہی ''اُردو''، کراچی، جولائی ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۲۔

۲۶۴۔ ایضاً: ص ۱۳۲۔

۲۶۵۔ جلیل قدوائی: ''گزارش''، مشمولہ ''مرقعِ مسعود''، ملخصاً ص ۹۔

۲۶۶۔ ایضاً: ص ۱۰۔

۲۶۷۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (تبصرہ) ''مرقعِ مسعود'' مطبوعہ سہ ماہی ''اُردو''، کراچی، جولائی ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۱۔

۲۶۸۔ ایضاً: ص ۱۳۱۔

۲۶۹۔ شان الحق حقی (تبصرہ): ''مرقعِ مسعود''، مشمولہ سہ ماہی ''اُردو نامہ''، کراچی، شمارہ ۲۶، ص ۱۰۵۔

۲۷۰۔ ایضاً: ص ۱۰۵۔

۲۷۱۔ ایضاً: ص ۱۰۵۔

۲۷۲۔ مرتبہ جلیل قدوائی، طبع اوّل، کراچی، راس مسعود اکادمی، ۱۹۷۰ء۔

۲۷۳۔ ملاحظہ ہو جلیل قدوائی: ''مسئلہ یادگارِ مسعود''، سنہ ندارد، کراچی، راس مسعود اکادمی، پاکستان۔

۲۷۴۔ جلیل قدوائی: ''مسئلہ یادگارِ مسعود''، مشمولہ ''خیابانِ مسعود''، ملخصاً، از ص ۱۱۳۔

۲۷۵۔ ایضاً: ص ۱۱۳۔

۲۷۶۔ شان الحق حقی: (تبصرہ) ''خیابان مسعود'' مطبوعہ سہ ماہی ''اُردو نامہ''، کراچی، شمارہ ۴۰، ستمبر ۱۹۷۱ء، ص ۱۵۵۔

۲۷۷۔ ایضاً: ص ۱۵۵۔

۲۷۸۔ ایضاً: ص ۱۵۵۔

۲۷۹۔ ''شعلۂ مستعجل''، مرتبہ جلیل قدوائی، طبع اوّل، کراچی، راس مسعود اکادمی، ۱۹۸۲ء۔

۲۸۰۔ جلیل قدوائی: (مضمون) ''علامہ اقبال اور راس مسعود''، مشمولہ، ایضاً، ص ۵۰۔

۲۸۱۔ جلیل قدوائی: ایضاً، ص ۴۲ (حصۂ انگریزی)

۲۸۲۔ ''شعلۂ مستعجل'' پر تبصرہ مشمولہ ''فاران'' کراچی، جلد نمبر ۳۵، شمارہ ۵، فروری ۱۹۸۴ء، ص ۵۶۔

۲۸۳۔ بحوالہ جلیل قدوائی: ''اوراقِ گُل''، طبع اوّل، کراچی، راس مسعود اکادمی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۲ کا حاشیہ۔

۲۸۴۔ مشفق خواجہ: ''ایک پہلودار شخصیت''، مشمولہ ''اوراقِ گُل''، مرتبہ: جلیل قدوائی، ایضاً، ص ۱۱۔

۲۸۵۔ ایضاً: ص ۱۱۔

۲۸۶۔ ایضاً: ص ۱۲۔۱۱

۲۸۷۔ اقتباس از مکتوبِ مختار مسعود بنام جلیل قدوائی: مطبوعہ ''اوراقِ گُل''، ص ۱۶۰۔

۲۸۸ ''اوراقِ گُل''، مرتبہ جلیلؔ قدوائی، طبع اوّل، کراچی، راس مسعود اکادمی، ۱۹۸۹ء۔

۲۸۹ مشفق خواجہ: ''ایک پہلودار شخصیت''، ایضاً، ص ۱۰۔

۲۹۰ ایضاً: ص ۱۰۔

۲۹۱ ایضاً: ص ۱۰۔

۲۹۲ ایضاً: ص ۱۰۔

۲۹۳ محمد احمد سبزواری (مضمون): ''زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اُس کی''، مشمولہ ایضاً، ص ۲۸۔

۲۹۴ بحوالہ ممنون حسن خان، مصاحبہ بعنوان: ''سرسیّد ثانی بھوپال میں''، مشمولہ ''اوراقِ گُل''، ایضاً، ص ۳۷۔

۲۹۵ ''بہ نام مسعود'' کے سلسلے میں ملاحظہ ہو: ''اوراقِ گُل''، ایضاً، ص ۱۲ اور اس کا حاشیہ۔

۲۹۶ مولوی ثناء الحق صدیقی (علیگ) (تبصرہ) ''اوراقِ گُل''، مطبوعہ ''العلم''، کراچی، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۰ء، ص ۱۰۷ تا ۱۰۸۔

۲۹۷ ''مادری زبان میں تدریس''، اُس زبانی شہادت کا اُردو ترجمہ ہے جو راس مسعود نے ۴/اکتوبر ۱۹۲۴ء کو بمبئی میں ایک سرکاری کمیشن کے روبرو دی تھی۔ جس کے صدر کوئی صاحب فادر بلیٹر تھے۔ زیرِ بحث مسئلہ مادری زبان کو ذریعۂ تدریس بنانے کا تھا جس پر راس مسعود نے تن تنہا پورے کمیشن کو زچ کر دیا تھا۔ کمیشن کے دوسرے ارکان سر ڈنشا پیٹٹ، ڈاکٹر آر، پرنجپائی، مسٹر مرزا اظہر علی خان (وائس چانسلر بمبئی یونیورسٹی)، مسٹر ایم آر جیکر، مسٹر کے نٹ راجن اور پروفیسر کے مائی شاہ جیسے اپنے وقت کے جغادری ماہرینِ تعلیم، علماء و مبصرین تھے۔

یہ شہادت جلیلؔ قدوائی نے راس مسعود سوسائٹی کی طرف سے شائع شدہ اپنے مرتب کیے ہوئے مجموعۂ مضامین 'خیابانِ مسعود' کے انگریزی حصّے میں شائع کی تھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی صدر نشینی مقتدرہ قومی زبان کے زمانے میں جلیلؔ قدوائی سے یہ مجموعہ حاصل کر کے اس شہادت کا ترجمہ ایک کتابچے کی شکل میں شائع کیا تھا۔ لیکن اس میں ایک قابلِ شکایت بات یہ رہ گئی کہ مقتدرہ نے راس مسعود سوسائٹی یا جلیلؔ قدوائی کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔

''اوراقِ گُل'' میں جلیلؔ قدوائی نے مقتدرہ ہی کا شائع کردہ اُردو ترجمہ شکریے کے ساتھ شریکِ اشاعت کیا ہے۔

[''مادری زبان میں تدریس'' مشمولہ ''اوراقِ گُل'' کے ابتدائی نوٹ (از مرتب جلیلؔ قدوائی) سے ملخصاً ص ۱۲۵ تا ۱۲۶۔ ایضاً]

۲۹۸ اقتباس از مکتوب ڈاکٹر مختار الدین احمد بہ نام جلیلؔ قدوائی، محررہ ۱۹/نومبر ۱۹۹۲ء، مطبوعہ و مشمولہ ''تحقیق'' جام شورو، شمارہ: ۱۶، ۲۰۰۸ء، ص ۱۵۰۔

۲۹۹ ''سرسیّد علیہ الرحمہ مع ضمیمہ سیّد محمود''، مرتبہ: جلیلؔ قدوائی، طبع اوّل، کراچی، راس مسعود اکادمی، ۱۹۸۵ء۔

۳۰۰ جلیلؔ قدوائی: ایضاً، ص ۹۶ تا ۱۰۹۔

۳۰۱ ایضاً: ص ۱۷۴ تا ۱۸۴۔

۳۰۲ سیّد سعید جعفری: ایضاً، حصہ انگریزی، ص ۹ تا ۴۱۔

۳۰۳ شان الحق حقی (تبصرہ): ''خیابانِ مسعود''، مطبوعہ ''اُردو نامہ''، کراچی، شمارہ ۴۰، ستمبر ۱۹۷۱ء، ص ۱۵۵۔

۳۰۴ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (مضمون): ''کچھ ذکر کتابوں کا، کچھ باتیں یادوں کی''، مشمولہ ''تہذیب''، کراچی، جون ۱۹۹۰ء، ص ۵۸۔

فہرستِ اسنادِ محوّلہ:

۱۔ انجم، خلیق، ڈاکٹر: ۱۹۶۷ء، ''متنی تنقید''، طبع اوّل، ادارۂ خرام پبلی کیشنز، دہلی۔

۲۔ بدایونی، شمس الدّین، ڈاکٹر: ۲۰۰۰ء، مرتبین: نذیر احمد، پروفیسر، مختار الدین، پروفیسر، قاسمی، شریف حسین، ''یادگار نامۂ قاضی عبدالودود''، طبع اوّل، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔

۳۔ ثاقب، شہاب الدّین، ڈاکٹر: ۱۹۸۵ء، ''باباے اُردو، مولوی عبدالحق۔ حیات اور علمی خدمات''، طبع اوّل، انجمن ترقی اُردو، کراچی۔

۴۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر: ۱۹۸۷ء، ''تاریخ ادبِ اُردو''، جلد دوم، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۵۔ حسرت موہانی، مولانا: ۱۹۲۵ء، ''انتخابِ سخن''، حصہ اوّل، طبع کان پور۔

۶۔ حقی، شان الحق: ۱۹۹۵ء، (مرتّب)، ''فرہنگِ تلفظ''، طبع اوّل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

۷۔ خویشگی، خان، محمد عبداللہ: ۱۹۸۹ء (مرتّب)، ''فرہنگِ عامرہ''، طبع اوّل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

۸۔ رفاعی، احمر، ڈاکٹر: ۲۰۰۰ء، ''شعلۂ طور، طباعت اوّلین و مابعد، ایک تجزیاتی مطالعہ''، طبع اوّل، کراچی۔

۹۔ زیدی، نیّر معراج، سید، ڈاکٹر: ۱۹۹۵ء، ''باباے اُردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ فن اور شخصیت''، طبع اوّل، ابلاغ، لاہور۔

۱۰۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر: ۱۹۸۶ء، مرتّب، ''اُردو میں اُصولِ تحقیق''، جلد اوّل، طبع اوّل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

۱۱۔ سلطانہ بخش، ایم، ڈاکٹر: ۱۹۸۶ء، مرتبہ، ''اُردو میں اُصولِ تحقیق''، جلد اوّل، طبع دوم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

۱۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ۱۹۸۶ء، ''اُردو، ادب کی مختصر ترین تاریخ''، بارہویں اشاعت، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

۱۳۔ شاہین، رحیم بخش، ڈاکٹر: ۱۹۷۵ء، ''اوراقِ گم گشتہ''، طبع اوّل، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور۔

۱۴۔ شیرانی، مظہر محمود، ڈاکٹر: ۱۹۹۳ء، ''حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات''، جلد اوّل، طبع اوّل، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۱۵۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر: ۲۰۰۱ء، ''اُردو تنقید کا ارتقا''، طبع پنجم، انجمن ترقی اُردو، کراچی۔

۱۶۔ عبدالحق، مولوی: ۱۹۹۶ء، ''قواعدِ اُردو''، سترہویں اشاعت، انجمن ترقی اُردو، ہند، نئی دہلی۔

۱۷۔ فربنک، پی این، ۱۹۷۷ء، Furbank, PN، ''ای ایم فوسٹر اے لائف'' (جلد اوّل)، طبع اوّل، "EM Forster A Life"، Secker and Warburt, England۔
۱۸۔ قدوائی، جلیل احمد: ۱۹۳۷ء، مُرتّب، ''دیوانِ بیدار''، طبع اوّل ہندستانی اکیڈمی، الٰہ آباد۔
۱۹۔ قدوائی، جلیل احمد: ۱۹۶۳ء، ''مکتوباتِ عبدالحق''، مکتبہ اسلوب، کراچی۔
۲۰۔ قدوائی، جلیل احمد: ۱۹۶۴ء، مرتّب، ''مجلّہ یادگارِ مسعود''، طبع اوّل، راس مسعود سوسائٹی، کراچی۔
۲۱۔ قدوائی، جلیل احمد: ۱۹۶۸ء، مرتّب، ''سفرِ جاپان''، "Travel in Japan"، طبع اوّل، راس مسعود اکادمی، کراچی۔
۲۲۔ قدوائی، جلیل احمد: ۱۹۷۰ء، ''خیابانِ مسعود''، طبع اوّل، راس مسعود سوسائٹی۔
۲۳۔ قدوائی، جلیل احمد: ۱۹۷۷ء، ''چند اکابر، چند معاصر''، طبع اوّل، ادارۂ نگارش و مطبوعات، کراچی۔
۲۴۔ قدوائی، جلیل احمد: ۱۹۸۲ء، ''شعر اور شعریات''، طبع اوّل، راس مسعود اکادمی، کراچی۔
۲۵۔ قدوائی، جلیل احمد: ۱۹۸۲ء، مُرتّب، ''شعلۂ مستعجل''، راس مسعود سوسائٹی، کراچی، طبع اوّل۔
۲۶۔ قدوائی، جلیل احمد: ۱۹۸۴ء، مُرتّب، ''فوسٹر مسعود لیٹرز''، "Forster-Masood Letters"، طبع اوّل، راس مسعود سوسائٹی، کراچی۔
۲۷۔ قدوائی، جلیل احمد: ۱۹۸۵ء، مُرتّب ''سرسیّد علیہ الرحمہ مع ضمیمہ سیّد محمود''، طبع اوّل، راس مسعود اکادمی، کراچی۔
۲۸۔ قدوائی، جلیل احمد: ۱۹۸۶ء، مُرتّب، ''ریس آف گولڈ''، "Realms of Gold"، (مترجم) سیّد راس مسعود، راس مسعود اکادمی، طبع اوّل، کراچی۔
۲۹۔ قدوائی، جلیل احمد: ۱۹۸۸ء، ''خاکسترِ پروانہ''، (تیسرا شعری مجموعہ) طبع اوّل، مکتبہ ''ہم زبان''، کراچی۔
۳۰۔ جلیل قدوائی: ۱۹۸۹ء، مرتبہ: ''اوراقِ گُل''، طبع اوّل، راس مسعود اکادمی، کراچی۔
۳۱۔ قدوائی، جلیل احمد: ۱۹۹۰ء، ''تجزیے اور تجربے''، طبع اوّل، راس مسعود سوسائٹی، کراچی۔
۳۲۔ قدوائی، جلیل احمد: ۱۹۹۲ء، مُرتّب، ''انشائے ہاشمی''، طبع اوّل، راس مسعود سوسائٹی، کراچی۔
۳۳۔ قدوائی، جلیل، احمد: سن ندارد، (تقریر) ''مسئلہ یادگارِ مسعود''، راس مسعود اکادمی، کراچی۔
۳۴۔ گیان چند، ڈاکٹر، ۱۹۸۸ء، ''ابتدائی کلامِ اقبال۔ بہ ترتیبِ مہ و سال''، شائستہ پبلشنگ ہاؤس، کراچی۔
۳۵۔ گورکھ پوری، مجنوں: ۱۹۶۶ء، ''نقوش و افکار''، طبع اوّل، صفیہ اکیڈمی، کراچی۔
۳۶۔ محوی، محمد حسین، ۱۹۳۶ء، مرتّب، ''دیوانِ بیدار''، طبع اوّل، شاہی پریس، مدراس۔
۳۷۔ مشفق خواجہ: ۱۹۷۹ء، ''جائزہ مخطوطاتِ اُردو''، جلد اوّل، مرکزی اُردو بورڈ، لاہور، طبع اوّل۔
۳۸۔ معین الرحمٰن، سید، ڈاکٹر: ۱۹۹۵ء، مرتبہ ''نقدِ عبدالحق''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور۔

رسالہ:

۳۱۔ سہ ماہی ''اُردو''، ۱۹۵۲ء، کراچی۔

۲۰۔ سہ ماہی ''اُردو''، جولائی ۱۹۶۶ء، کراچی۔

۳۷۔ سہ ماہی ''اُردو''، شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء، کراچی۔

۱۰۔ سہ ماہی ''اُردو نامہ''، شمارہ ۲۶، کراچی۔

۵۔ سہ ماہی ''اُردو نامہ''، شمارہ ۳۲، کراچی۔

۱۱۔ سہ ماہی ''اُردو نامہ''، شمارہ ۴۰، کراچی۔

۳۲۔ ماہ نامہ ''العلم''، جولائی تا ستمبر ۱۹۶۲ء، کراچی۔

۶۱۔ شش ماہی ''تحقیق''، شمارہ: ۱۶، ۲۰۰۸ء، جام شورو۔

۲۱۔ ماہ نامہ ''تہذیب''، جون ۱۹۹۰ء، کراچی۔

۵۵۔ ماہنامہ ''زمانہ''، اگست ۱۹۳۷ء، کان پور۔

۲۵۔ ماہ نامہ ''سب رس''، اگست ۱۹۸۲ء، کراچی۔

۳۹۔ ماہ نامہ ''قومی زبان''، ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۴ء، کراچی۔

۴۱۔ ماہ نامہ ''فاران''، اگست تا اکتوبر ۱۹۸۰ء، کراچی۔

۵۶۔ ماہ نامہ ''فاران''، فروری ۱۹۸۴ء کراچی۔

۵۹۔ ماہ نامہ ''قومی زبان''، اگست ۱۹۷۵ء کراچی۔

۶۵۔ ماہ نامہ ''قومی زبان''، جنوری ۱۹۷۶ء، کراچی۔

۳۰۔ ماہ نامہ ''ہمایوں''، مئی ۱۹۵۱ء لاہور۔

۲۔ سہ ماہی ''مخزن''، نومبر ۱۹۰۱ء، لاہور۔

۵۴۔ سہ ماہی ''نقوش''، شمارہ ۸۲۔۸۱، جون ۱۹۶۰ء، لاہور۔